فیضانِ معرفت

جلد اوّل

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور
و خلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

جملہ حقوق بہ حق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : فیضانِ معرفت جلد اوّل

افادات : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی و مہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

خلیفۂ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ، ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتّب : محمد زبیر استاذ الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

صفحات : ۲۰۰

تاریخ طباعت : شوال المکرم ۱۴۳۵ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

الفہرس

تائید وتوثیق	۱۲
تقریظ	۱۵
عارفانہ نظم	۱۸
تمہید	۱۹
وصول الی اللہ میں تاخیر کی وجہ	۲۲
اگر کوئی ہدایت پانا چاہے؟	۲۳
نماز میں دل نہیں لگتا	۲۳
یہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا!!	۲۴
اپنے آپ کو مٹادو	۲۵
غصہ بہ قدر ضرورت ہو	۲۵
اپنے نفس کے لیے غصہ نہ کرے	۲۷
غصے کی بھی ضرورت ہے	۲۷
بدگمانی کا موقعہ دینا بھی غلط ہے	۲۷
﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ کی تفسیر	۲۸
لفظ ''مولوی'' کا معنی	۲۹
عبرت آموز حکایت	۳۰
گناہ زہریلا سانپ ہے	۳۱

عبادت میں لذت کیوں نہیں آتی؟	۳۱
مزہ نہ آئے تو دوا سمجھو	۳۲
اللہ کے دو حق ہیں	۳۳
دنیوی عیش میں سکون نہیں	۳۵
ایک طالبِ علم کا تقویٰ	۳۶
ظاہر، باطن کا ترجمان ہوتا ہے	۳۸
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فراست	۳۸
حضرت شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ کا ایک ارشاد	۳۹
نفس کی اصلاح - ایک بزرگ کا قصہ	۳۹
نفس کی چالیں	۴۱
حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کی فراست	۴۱
نفس کی اصلاح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا طریقہ	۴۲
حضرت رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا طریقۂ اصلاح	۴۳
مولانا روم رحمہ اللہ کی کایا کب پلٹی؟	۴۳
آپ متقی کیسے بن سکیں گے؟	۴۵
نفس کی اصلاح اعتدال کے ساتھ ہونی چاہیے	۴۶
تقویٰ کسے کہتے ہیں؟	۴۸
سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے - ایک عجیب قصہ	۴۹
اللہ کے بارے میں باخبر سے پوچھو	۵۲
دنیا کی حقارت - ایک عمدہ مثال	۵۳

شیطان کی دعا بھی قبول ہوئی	۵۵
غیر مستند واعظ سے احتراز کرو!	۵۵
اللہ کی نعمت کا اندازہ کرو- ایک بزرگ کا قصہ	۵۶
آئینہ چینی شکست!	۵۷
اللہ کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے	۵۸
لقمان حکیم رحمۃ اللہ کا شکر	۵۹
نیکیوں کی توفیق سب سے بڑی نعمت ہے- ایک واقعہ	۶۰
قلب، اللہ کا مکان ہے	۶۱
جذبۂ شکر پیدا کرنے کا طریقہ	۶۳
دل زنگ آلود ہو جاتا ہے	۶۳
دلوں پر زنگ کیوں آتا ہے؟	۶۵
بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کے دودھ کا واقعہ	۶۵
دین میں ایسی استقامت آجائے، ایک واقعہ	۶۶
انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں	۶۷
کبھی کتے سے بھی سبق مل جاتا ہے	۷۱
اساتذہ کی بے ادبی کا عبرت ناک انجام	۷۱
کسی کو حقیر نہ سمجھو	۷۲
حقیر سمجھنے کا انجام- ایک عبرت ناک حکایت	۷۳
گناہ کر کے حقیر سمجھنا بہتر ہے	۷۴
واعظین اپنے کو بڑا نہ سمجھیں	۷۵

ایک بزرگ کا قصہ ۷۵
جو دل اللہ سے غافل ہو وہ مردہ ہے۔ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ کا واقعہ ۷۶
جانور سے بھی اپنے کو افضل نہ سمجھے ۷۷
امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی تواضع ۷۷
بوعلی سینا اخلاق ندارد ۷۸
کرتے رہے پھر بھی ڈرتے رہے ۷۹
بچوں کو نیک بنانے ماں باپ کا نیک ہونا ضروری ہے ۸۰
﴿سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ﴾ درخواست ہے ۸۰
انسان کی چار حالتیں ۸۱
شکر گزار فقیر افضل ہے ۸۲
نرا خوف شیطان کو بھی حاصل تھا ۸۲
ایک سوال کا جواب ۸۴
اللہ والا بننے کے لیے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں ۸۵
ہم تو سنار تھے، لوگوں نے لوہار سمجھ لیا ۸۷
خوفِ خدا کی فضیلت ۸۷
حضرت مولانا اسد اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی تواضع ۸۹
امام شافعی رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ ۹۰
ایک عبرت آموز حدیث ۹۲
ایک عظیم علم اور نکتہ ۹۵
خوف اور محبت کی ایک عجیب مثال ۹۷

خوف کی دو قسمیں	۹۸
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف	۹۹
ہماری بے خوفی وغفلت	۱۰۰
خوفِ خدا بھی مانگنا چاہیے	۱۰۰
آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خوفِ خدا	۱۰۱
حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خوفِ آخرت	۱۰۲
حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف	۱۰۴
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت	۱۰۵
امام ابن مبارک رحمہ اللہ کا حال	۱۰۶
ایک پتھر کا خوفِ خدا میں رونا	۱۰۷
عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک لکڑی کا رونا	۱۰۸
ہر چیز میں حیات وشعور ہے	۱۰۹
قرآن سے دلیل	۱۱۱
خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت	۱۱۲
دنیا میں رونا سیکھو	۱۱۳
اللہ کو رونا بہت پسند ہے۔ایک واقعہ	۱۱۳
آنکھ کو حرام لذت سے بچاؤ	۱۱۵
سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ	۱۱۷
اصل حسن یہ ہے!!۔ایک واقعہ	۱۱۹
ایک حیرت ناک واقعہ	۱۲۰

کبھی کبھی قبر کے احوال کھل جاتے ہیں ۱۲۴
عذابِ قبر کا ثبوت ۱۲۵
کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو ۱۲۶
تہجد کے دو رکعت ہی کام آئے ۱۲۷
عمل پر نہیں، رحمت پر بھروسہ ہو ۱۲۸
ایک علمی نکتہ ۱۲۹
بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ ۱۳۰
عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ کی عاجزی ۱۳۱
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کی عاجزی ۱۳۱
حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ کی تواضع ۱۳۲
شانِ عبدیت ۱۳۲
''مریدِ صادق'' کی تعریف ۱۳۳
استغفار بھی استغفار کے قابل ۱۳۴
عاجز گنہ گار، متکبر عابد سے بہتر ہے ۱۳۴
اللہ سے اللہ ہی کو مانگو ۱۳۵
ایک حکایت ۱۳۵
عوام ہماری قدر نہیں کرتی ۱۳۷
حضرت شاہ ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ کا ارشاد ۱۳۷
بغیر تمرین کے صرف تدریس بے کار ہے ۱۳۸
عبادت و ریاضت اللہ کا فضل ہے۔ایک واقعہ ۱۳۹

ایک دن منزل ضرور ملے گی	۱۴۰
حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ کے اعلیٰ ترین اخلاق	۱۴۱
شیخ کو احوال کی اطلاع دینا ضروری ہے	۱۴۲
فطرت بدل نہیں سکتی	۱۴۳
خوابوں کی حقیقت	۱۴۴
اللہ سے دین مانگو	۱۴۵
محبت میں اعتدال ہو	۱۴۶
سات آدمی عرش کے سایے میں	۱۴۸
ایک قرآنی دعا کی تفسیر	۱۴۸
''حاکم'' کی ایک دوسری شرح	۱۴۹
عدل کیا ہے؟	۱۴۹
ہمارا بدن اللہ کا باغ ہے	۱۵۰
ایک لطیفہ	۱۵۱
ڈاڑھی رکھنا فطرت ہے۔ایک لطیفہ	۱۵۱
جس کا خدا ایسا ہو–ایک واقعہ	۱۵۲
مقتدیٰ کا معیار۔لوگوں کے نزدیک	۱۵۳
مقتدیٰ کا معیار۔قرآن کی نظر میں	۱۵۳
ایک سوال کا جواب	۱۵۵
دنیادار کی اتباع سے بچو–ایک واقعہ	۱۵۶
کیا آج اللہ والے نہیں ہیں؟	۱۵۷

اللہ والے کہاں ملیں گے؟	۱۵۸
اہل اللہ کے اوصاف	۱۶۰
اگر ہدایت نہ پانا چاہے؟	۱۶۰
ایمان کی ٹھنڈک کیسے حاصل ہو؟	۱۶۱
طہارت کیا ہے؟	۱۶۲
طہارت کے چار اقسام ہیں	۱۶۳
سوئے حافظہ کا علاج	۱۶۴
مسیح الامت رحمۃ اللہ کا تعلیمی دور	۱۶۵
زبان تو ذکر کے لیے ہے	۱۶۶
مائے مستعمل ناپاک کیوں ہے؟	۱۶۷
سالک کا کام کیا ہونا چاہیے؟	۱۶۹
جیسی زندگی ویسی موت!!	۱۷۰
حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ کی وفات کا واقعہ	۱۷۱
ایک بزرگ کی موت کا واقعہ	۱۷۲
شقاوت و بدبختی کی علامت	۱۷۲
ایک بزرگ کا استحضارِ موت۔ایک واقعہ	۱۷۳
آخرت کے عمل میں نیت کی کمزوری	۱۷۵
استحضارِ موت کے لیے مراقبہ	۱۷۵
﴿أيام خالية﴾ کی دو تفسیریں	۱۷۶
ایک دلہن سے عبرت	۱۷۶

دنیادار کون ہے؟	۱۷۷
نیم شب کی دولت	۱۷۸
گناہ ظلمت ہے	۱۷۹
نیک جذبہ مہمان خدا ہے	۱۷۹
گنہ گاروں کے لیے سامان تسلّی	۱۸۰
معرفت کی حقیقت	۱۸۲
ایک حدیث پر شبہے کا جواب	۱۸۳
ہماری دعا قبول نہ ہونے کا سبب	۱۸۶
دنیوی عیش باعث شرمندگی ہوگا-ایک واقعہ	۱۸۶
ایک سوال کا جواب	۱۸۷
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضارِ موت	۱۸۹
زہدوعبادت کا غرور زہر قاتل	۱۸۹
عبادت کا کفارۂ سیئات ہونا صغیرہ کے ساتھ مختص ہونے کی حکمت	۱۹۱
"الدنیا سجن المؤمن" کی عجیب تشریح	۱۹۱
درجاتِ قرب-ایک اہم تنبیہ	۱۹۳
یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا استحضار موت	۱۹۶
آج دنیا میں بڑے اللہ والے کیوں نہیں؟	۱۹۷
نظم	۱۹۹

تائید و توثیق

حضرت مولانا محمد ذاکر رحیمی صاحب رحمہ اللہ
(خلیفۂ حضرت مولانا محمد فضل الرحیم صاحب پرنامبٹی رحمہ اللہ)

مؤمن کا مقصد تقوی اللہ ہے، جس کا ثمرہ ہے حسنِ عاقبت، ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ اوراس کا حکم اس طرح دیا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ﴾ اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ ہلکا پھلکا تقویٰ یا تقوے کی ظاہری شکلیں مقصود ہیں نہ مفید، بل کہ حق التقویٰ مطلوب ہے، جس کی تعیین حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگی "اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا ، وَ أَشَارَ إِلٰی صَدْرِهٖ" یہ قلبی کیفیت ہے، جس کے لیے ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ کی شرط لگائی، یہ اہلِ صدق کون ہیں؟ یقیناً وہ جن کا ظاہر و باطن، حال وقال صدق کا آئینہ دار ہو۔ مزید تشریح حدیثِ جبرئیل سے ہوسکتی ہے، جو اس قدر مشہور و معروف ہے کہ بیان کی حاجت نہیں۔ ہاں! ملخصاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمانی تصدیق کا ثبوت ظاہری احکام اور ارکانِ اسلام کی ادائیگی سے ملے گا؛ مگر تصدیقِ قلبی کے بعد ظاہری اعمال کی ادئیگی میں قلب بھی بہ نیۂ شریک ہے یا نہیں؟ اور اس کا رخ کدھر ہے؟ اس کے لیے احسان ضروری قرار دیا گیا ہے (أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ)۔

خیر القرون کے بعد کذب وجہل کے شیوع کی وجہ سے ایک طرف علومِ شریعت کی صحت خطرے میں پڑگئی، تو دوسری طرف دولتِ باطنی یعنی صدق واحسان کا سفینہ بھی ڈوبنے لگا اور امتِ مسلمہ صرف ایمان واسلام کے ظاہری ارکان واعمال پر

اکتفا کرنے لگی، تب اہل تحقیق وتوفیق نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا، صدق وصفا کے لیے ترکِ لذات ونعم کے ساتھ کڑے مجاہدات کی راہ اختیار کی، کارِ صفا اور لبسِ صوف کی وجہ سے ''صوفیاء'' ان کا لقب ہوگیا پھر تصوف کے مستقل فن کی داغ بیل پڑی، بعض ظاہر پرستوں نے نکیر وملامت کی تو حضرت امام مالک امام دور الہجرۃ رحمۃ اللہ نے جامع الفاظ میں حقیقت کا اظہار فرمایا: ''مَنْ تَفَقَّهَ وَ لَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ ، وَمَنْ تَصَوَّفَ وَ لَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ ، وَمَنْ جَمَعَ بَيْنَهُمَا فَقَدْ تَحَقَّقَ'' (جوصوفی نہ بن سکا وہ فاسق ٹھہرا، جوصوفی دین وشریعت کا پابند نہ بنا، وہ زندیق یعنی دین سے باہر ہوا اور جس نے فقہ وتصوف کو جمع کیا یعنی شریعت وطریقت کا جامع ہوا، اس نے حقیقت کو پالیا) شیخ الاسلام زکریا انصاری رحمۃ اللہ کی اس حقیقت بیانی کی داد دیجیے، فرمایا: ''الشَّرِيعَةُ ظَاهِرُ الْحَقِيقَةِ ، وَالْحَقِيقَةُ ظَاهِرَ الشَّرِيعَةِ ؛ وَ هُمَا مُتَلازِمَتَانِ ، لا يَتِمُّ أَحَدُهُمَا إِلَّا بِالْآخَرِ '' (شریعت کیا ہے؟ حقیقت کا ظاہر ہے اور حقیقت شریعت کا باطن، دونوں اس طرح لازم وملزوم ہیں کہ ایک کو چھوڑ وتو دوسرا بھی ختم) پھر اتباع ہویٰ اور فسق والحاد کے سوا کیا دھرا رہ گیا؟!!

الحمدللہ ہمارے اکابر حضراتِ مشائخ دیوبند -قدس اللہ اسرارہم- اپنے وقت کے جامعین شریعت وطریقت تھے یا کہیے کہ شرابِ حقیقت سے لبریز خوبصورت جامِ شریعت تھے۔

> در کفے جامِ شریعت، در کفے سندانِ عشق
>
> ہر ہوسناکہ نہ داند، جام وسنداں باختن

کا نمونہ تھے۔ بارگاہِ خداوندی میں ان حضرات کی مقبولیت کا شاہد عدل دیکھیے کہ کم سے کم مدت میں ان حضرات کے سلاسل چار دانگ عالم مشہور ومعروف ہوئے، شاید

ہی کوئی خطہ ہو، جہاں ان نفوس قدسیہ کے کفش بردار موجود نہ ہوں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیا اثری کا ایک نمونہ؛ بل کہ انھی کے ساختہ و پرداختہ ہمارے محترم مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب زید مجدہم وعمت فیوضہم بھی ہیں، جنھیں اللہ تعالی نے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ الحمدللہ ان کی مساعی کثیرہ وجہودِ مسلسلہ کی مقبولیت کو دیکھ کر دل یہ کہتا ہے کہ یہ موفق من اللہ ہیں۔ **اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔**

مولانا موصوف کی تقاریر تو الحمدللہ شائع وذائع ہیں؛ مگر مجالس وملفوظات کا شاید یہ پہلا مجموعہ ہے، جو مولانا کے رفقائے کار کی محنتوں سے جمع وترتیب اور اشاعت سے آراستہ، شائقین کے ہاتھوں پہنچ رہا ہے۔ اللہ پاک اس کو بھی نافع بنائے اور قبولِ عام وتام سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

محمد ذاکر رحیمی

تقریظ

مولانا مفتی افتخار احمد صاحب قاسمی زید مجدہ

(مہتمم مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن، بنگلور وصدر جمعیۃ العلماء کرناٹک)

خالق کائنات نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی مقصد کی نشاندہی قولاً وعملاً کرنے کے لیے انبیائے کرام کا مبارک سلسلہ جاری فرمایا، جو خلاصۂ کائنات فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر ختم کر دیا گیا، اب یہ ذمے داری آپ کی امت کے اس طبقے پر ڈالی گئی، جن کو آپ نے اپنا وارث قرار دیا اور علمائے کرام کا یہ مبارک طبقہ اس فریضے کو بہ حسن وخوبی انجام دے رہا ہے۔ در حقیقت انسان کو انسانیت اور سچائی و پاکیزگی اور مختلف خداؤں کے بہ جائے وحدہ لاشریک کی پیروی کرنے اور ان میں عشق ومعرفت پیدا کرنے میں سلفِ صالحین، اولیائے عظام اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی صحبتیں اور ان کی مجلسیں ہر زمانے میں مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان میں تبلیغِ اسلام اور دینی علوم کی ترویج واشاعت انھی علمائے ربانیین اور مشائخِ طریقت کے ذریعے ہوئی اور لاکھوں بندگانِ خدا، ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر اور ان کے مواعظ وملفوظات سن کر حلق بہ گوش اسلام ہوئے۔

مشائخِ طریقت اور صوفیائے کرام کے مواعظ وملفوظات کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا مبارک سلسلہ، دوسری صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا، چناں چہ شیخِ طریقت امیر المؤمنین في الحدیث حضرت عبد اللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہ کی کتاب "الزُّھْدُ

وَالرَّقَائِقُ“ اسی طرح حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب ’الزُّھْدُ‘“ اہم تصنیفات میں شامل ہیں، ان کے علاوہ دیگر صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کے ملفوظات بھی محفوظ ہیں۔

تصوف جس کو حدیث کی اصطلاح میں ”احسان“ کہا جاتا ہے، معبودِ حقیقی تک پہنچنے کا ایسا راستہ ہے کہ انسان اس راہ پر چل کر ربِ حقیقی سے انتہائی قریب ہو جاتا ہے، ہر دور اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہوتے ہیں، جو علم وفضل، خلوص وللّٰہیت، ورع وتقویٰ، عبادت وریاضت؛ نیز اتباعِ سنت میں اسلافِ کرام کے پرتو ہوتے ہیں۔ انھی مقدس ہستیوں میں صوبہ کرناٹک کی مشہور ومعروف علمی شخصیت حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم (مجازِ بیعت حضرت مفتی مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ) کی ہے، جن کی تعلیم وتربیت ولی کامل عارف باللہ حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کی زیر نگرانی ہوئی ہے اور بعد میں محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ سے بھی بھی خوب استفادہ کیا ہے، آپ کی ہمہ گیر شخصیت نے اصلاح کا کوئی ایسا پہلو نہیں چھوڑا، جس کے ذریعے آپ دین کی امانت لوگوں تک پہنچا سکتے ہوں۔ درس وتدریس، تصنیف و تالیف، وعظ وارشاد، مجالسِ تفسیر وحدیث، قضا وافتا کے ساتھ اب اپنے اکابر و اسلاف اور مشائخ عظام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مجالس کا مبارک سلسلہ بھی شروع فرمایا، جس میں آپ کے مریدین ومتعلقین کی کثیر تعداد شریک ہو کر اپنے قلوب کو منور کر رہی ہے۔

زیرِ نظر کتاب ”فیضانِ معرفت“ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی مجالس کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے شاگردِ رشید برادرِ عزیز مولانا محمد زبیر احمد قاسمی نے نہایت سلیقہ مندی سے مجالس میں ذکر کردہ منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے کی

تقریظ

کامیاب کوشش کی ہے اور مجلس میں حاضر نہ ہونے والوں کے لیے بھی استفادے کا موقع فراہم کردیا -فجزاهم الله أحسن الجزاء - کتاب کے اندر علما و مشائخ، صاحبِ نسبت بزرگان دین اور مصلحین امت کے ملفوظات وارشادات کے علاوہ راہِ سلوک طے کرنے والوں کے لیے بہت ہی قیمتی اور مؤثر مواد موجود ہے، جسے سننے، بڑھنے اور عمل کرنے سے ان شاء اللہ زندگی میں عظیم انقلاب پیدا ہوگا۔ اللہ اس کتاب کو قبول فرمائے اور اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔ آمین۔

افتخار احمد
مدرسہ تعلیم القرآن، بنگلور

عارفانہ نظم

نتیجۂ فکر: حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب شعیب مفتاحی دامت برکاتہم

نام حق تعالیٰ جو جم گیا ہے سینے میں
پا رہا ہوں بے شک میں لطف و کیف جینے میں

مست ہو جو فانی میں کیا خبر اسے اس کی
کیا مزہ ہے مخفی اس عشقِ حق کے پینے میں

عشقِ حق میں مرنا ہی، قربِ حق کا رستہ ہے
شوق گر ہو مرنے کا رکھ قدم سفینے میں

گر تجھے محبت کا ذاتِ حق سے ہو دعویٰ
مان لے محمد ﷺ کی جو ہوئے مدینے میں

عشقِ حق میں مرنے پر زندگی نئی دے دی
ہر قدم فنا کا اب ہے بقا کے زینے میں

خالق دو جہاں وہ مالک دو عالم وہ
شانِ کبریا راسخ دل کے ہے نگینے میں

کر سوال حاجت کا تو خدائے برتر سے
ساری دولتیں ہیں جس ذات کے خزینے میں

شیخ باخدا سے تم معرفت کی راہیں لو
یہ علوم عرفانی، ہیں کہاں سفینے میں

اے شعیبؔ نالوں میں گر اثر خدا دیدے
سوزِ غم میسر ہو دل کے آبگینے میں

التمہید

حامدًا و مصلیاً:

اللہ رب العزت اپنی کتابِ مبین میں فرماتے ہیں: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الأعلیٰ :۱۴) (تحقیق کہ فلاح پا گیا وہ شخص جو تزکیہ حاصل کرلیا) یعنی جو اپنے قلب وقالب کو عقائدِ صحیحہ، اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ سے مزین کیا، وہ کامیاب ہوا۔

تزکیۂ نفس کا ذکر قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی مختلف سیاق وسباق میں وارد ہوا ہے، ایک جگہ نبی اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی بعثت کے مقاصد میں بھی باری تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ (آل عمران :۱۶۴) (اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جب کہ انھی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان پر اللہ کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے۔)

ایک اور جگہ تو کامیابی کا معیار ہی تزکیۂ نفس کو قرار دیا گیا ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (:۹-۱۰) (تحقیق کہ کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو ملوث کیا) معلوم ہوا کہ نفس کی اصلاح کرنا، اسے رذائل سے پاک کرنا اور اعمالِ صالحہ کا خوگر بنانا، یہ دین اسلام کا بنیادی مقصد اور شریعت کا عین مقتضیٰ ہے۔

اور عادۃ اللہ ہمیشہ یہی رہی ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ بھی بھیجے گئے

اور پھر انبیا کے بعد ان کے نائبین وورثین کا سلسلہ قائم و جاری رہا اور جس طرح دنیا میں کسی بھی علم وفن کی تحصیل کے لیے رہبر واستاذ کی ضرورت پڑتی ہے، اسی طرح اپنے باطن کو بنانے اور دل کو معرفتِ الٰہیہ کے نور کا مسکن بنانے اور محبتِ خداوندی سے معمور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں امت میں ایسے نفوس پیدا فرمائے ہیں، جو مختلف تدابیر سے امتِ مسلمہ کی اصلاح میں کوشاں رہتے ہیں، کوئی تدریس سے، کوئی تصنیف وتالیف سے، تو کوئی وعظ ونصیحت سے، انھی طریقوں میں سے اللہ والوں اور بزرگانِ دین کی مجالس بھی ہیں، جن کا فائدہ امت کو برابر ہوتا رہا ہے، جن سے ایک خلقِ کثیر اکتسابِ فیض کرتی رہی ہے اور ان مجالسوں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں، جو اپنے باطن کو آراستہ کر کے ستاروں کے مانند امت کے لیے مشعلِ راہ بنتے ہیں، انھی مجالس میں سے استاذی ومربی ومخدومی حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کی مجالس بھی ہیں، جو طلبہ کے لیے مدرسے میں ظہر بعد اور عوام کے لیے ہر اتوار بعد نماز مغرب تا عشا ہوتی ہیں، زمانۂ طالب علمی ہی سے بندے کے دل میں داعیہ تھا کہ حضرت والا کی مجالس کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرودوں؛ مگر تعلیمی مصروفیات مانع بن رہی تھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا تھا کہ اے اللہ! اس عاجز سے ان بیانات کو جمع کرنے کا کام لے لے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نصرت سے اس مجموعے کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے ان بیانات میں سے اصلاحِ قلب وتزکیۂ نفوس سے متعلق باتوں کو مختلف عناوین کے تحت جمع کر کے ایک کتابی شکل دینے کی سعادت نصیب ہوئی، چوں کہ ان مجالس کا مجموعہ اور مواد زیادہ تھا اور خدشہ ہوا کہ کہیں کتاب کی طوالت قاری کو اکتا نہ دے، اس لیے اختصار کے پیشِ نظر اس مجموعے کو جلدوار لانے کا ارادہ ہے، یہ پہلی جلد ہے ان شاء اللہ بقیہ جلدیں بھی بہت جلد آئیں گی۔

(فانتظروا إني معكم من المنتظرين)

بندے نے اس مجموعے کو مرتب کرنے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا اور درخواست کی کہ آپ اس پر نظر فرمالیں اور طبع کرانے کی اجازت عطا فرمائیں، تو حضرت الاستاذ نے بہ خوشی اجازت دی اور از اول تا آخر نظر ڈالی اور بعض جگہ جہاں تشنگی محسوس کی، اس کی وضاحت فرمائی اور کتاب میں ذکر کردہ احادیث کی تخریج کا حکم دیا اور مفید مشوروں سے نواز کر خاکسار کی ہمت افزائی فرمائی۔

میں ممنون و مشکور ہوں ان تمام حضرات کا جنھوں نے اس کی ترتیب میں میرا تعاون فرمایا، بالخصوص مولانا محمد یاسین خان صاحب قاسمی (مدرس جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم) جنھوں نے اپنی وہ کاپیاں جن میں انھوں نے ملفوظات جمع کیے تھے، عطا کیے اور مولانا اسماعیل خان صاحب قاسمی اور حافظ عبد المصور صاحب مسیحی، جنھوں نے اس کتاب کی ٹائپنگ میں بھرپور تعاون فرمایا۔ اللہ پاک جملہ معاونین کو اجرِ جزیل عطا فرمائے اور اس مجموعے سے امت کے ہر خاص و عام کو نفع پہنچائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین۔

محمد زبیر
استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ
مسیح العلوم، بنگلور

۱۸ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خاتم المرسلین، وعلی اٰلہ وأصحابہ أجمعین .

وصول الی اللہ میں تاخیر کی وجہ

فرمایا: اہل اللہ کی صحبت حاصل ہونے کے باوجود جن لوگوں کو بھی سلوک طے کرنے میں دیر ہورہی ہے اور وصول الی اللہ نصیب نہیں ہورہا ہے، ان کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ضرور کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہیں۔ ذکر بھی کرتے ہیں؛ مگر ذکر سے جہاں نور پیدا ہوا بدنظری کر کے یا کوئی اور گناہ کر کے، اس کو بجھادیتے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نیکیاں کرنے کا اہتمام کرتا ہے؛ لیکن گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتا، نیکی کرنے سے نور پیدا ہوتا ہے؛ مگر جب انسان گناہ کرتا ہے، تو وہ نور ختم ہوجاتا ہے، جس طرح کوئی ایک طرف سے آگ جلائے اور دوسری طرف سے بجھادے، اس طرح یہ آنکھ مچولی جیسا کھیل ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ وہ آدمی جہاں تھا، وہیں رہتا ہے اور کبھی اس کو وصول نصیب نہیں ہوتا۔ جیسے ایک برتن ہو، جس میں نیچے سوراخ ہو، آپ اس میں دودھ ڈال دیں، تو نیچے سے خالی ہوتا رہے گا، اسی طرح نماز پڑھتا ہو، ذکر کرتا ہو؛ مگر دل میں تکبر ہو، غیبت کرتا ہو، بدنظر میں مبتلا ہو، تو نیکیاں بھی اسی طرح خالی ہوتی رہیں گی؛ اس لیے سالک کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ گناہ ہرگز نہ کرے اور اپنے آپ کو تمام قسم کے گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرے۔

اگر کوئی ہدایت پانا چاہے؟

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں، تو عالم اور کائنات کا ہر ذرہ اس کے لیے ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے، ہر واقعے سے کوئی نہ کوئی بات وہ نکال لیتا ہے اور جس آدمی کو ہدایت نہیں ملنی ہے، اس کے سامنے قرآن پیش کیجیے، حدیث پیش کیجیے، دلائل کے انبار جمع کر دیجیے؛ لیکن اس سے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھاتا۔

جسے اللہ ہدایت دیتا ہے، تو وہ چڑیوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے، کتوں سے بھی ہدایت پالیتا ہے؛ حتی کہ خنزیر سے بھی ہدایت پالیتا ہے۔ ایک بزرگ نے خنزیر سے متعلق فرمایا کہ مجھے اس سے ہدایت ملی اور ہدایت یہ ملی کہ یہ جانور، جس کو لوگ عام طور پر گندا جانور کہتے ہیں، یہ بالکل صبح صبح اٹھتا ہے اور تمام جانوروں سے پہلے اپنی روزی کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس سے بھی ہم کو عبرت حاصل ہوئی اور ہدایت ملی کہ صبح جلدی اٹھنا چاہیے اور یہ کہ اپنے کام میں لگ جانا چاہیے۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ مجھے بلی سے ہدایت ملی اور ہدایت یہ ملی کہ بلی کو دیکھا کہ وہ چوہے کو پکڑنے کے لیے ایک ایک گھنٹہ مراقبے میں بیٹھ جاتی ہے، ایسا مراقبہ کہ نہ ادھر ہوتی ہے اور نہ ادھر ہوتی ہے، چوہے کی فکر میں بیٹھی رہتی ہے۔ فرمایا کہ اسی طرح ہم کو اللہ کے لیے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے۔ اگر انسان ہدایت پانا چاہتا ہے، تو کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے لیے ہدایت بن جاتا ہے۔

نماز میں دل نہیں لگتا

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت بہت کوشش کرتا ہوں کہ نماز میں یکسوئی

ہو؛ مگر دل میں طرح طرح کے خیالات ووساوس آتے رہتے ہیں، حضرت نے پہلے خواجہ مجذوب رحمہ اللہ کا شعر سنایا:

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں، اس فکر کے پاس بھی نہ جانا
دل لگنا کہاں ہے فرض تجھ پر؟ ترا فرض تو ہے دل لگانا

پھر ارشاد فرمایا: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ جب ہم بالقصد کسی چیز کی طرف دیکھتے ہیں، تو بالتبع اُس کے آس پاس کی چیزیں بھی نظر آنے لگتی ہیں، حال آں کہ اُن کو دیکھنا ہمارا مقصد نہیں ہوتا، بعینہٖ اسی طرح نماز میں ہمارا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور اُس کی طرف پوری توجہ کو مبذول کرنا ہوتا ہے؛ مگر پھر بھی دل میں دوسروں کی یاد اور وساوس آتے جاتے رہیں، تو یہ نماز کے لیے مضر نہیں اور خشوع کے خلاف بھی نہیں، ہمارا کام تو صرف دل لگانا ہے۔

ہاں! اپنے قصد وارادے سے کسی اور طرف توجہ کرنا اور ادھر اُدھر کی باتیں سوچنا، یہ خلافِ خشوع ہے۔

یہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا!!

بیشتر مجلسوں میں حضرت نے اپنا واقعہ سنایا کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ ومرشد واستاذ" حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ "کو خط لکھا، جس میں میں نے پوچھا کہ حضرت! کتنا ہی خشوع وخضوع ودل جمعی کے ساتھ نماز پڑھتا ہوں؛ مگر پھر بھی نماز کے بعد دل میں یہ خیال آتا ہے کہ نماز جیسی پڑھنی تھی ویسی نہیں پڑھ سکا، ابھی کچھ نقص باقی ہے، تو حضرت نے بہت ہی عجیب جواب لکھا، جس میں فرمایا کہ" یہ خیال تو ٹھیک ہے اور جس دن یہ خیال کرلیا کہ آج میں نے نماز کما حقہ ادا کی ہے، وہ تو تمہارے ماتم کا دن ہوگا"۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کبھی بھی اپنی عبادت وریاضت پر ناز نہ ہونا چاہیے؛ بل کہ ہر وقت یہی خیال کرنا چاہیے کہ ہم سے اللہ کے شایانِ شان کچھ نہ ہوسکا اور اگر کسی نے یہ سمجھا کہ میں نے بڑی شان دار عبادت کی ہے اور اس پر اترانے لگا اور بڑائی کرنے لگا، تو یہ اس کے لیے رسوائی کا سبب ہوگا۔

اپنے آپ کو مٹا دو

ایک مرتبہ مجلس میں بتی جل رہی تھی، حضرت نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ اس سے عبرت حاصل کرو کہ یہ اپنے وجود کو مٹا کر دوسروں کو نفع پہنچاتی ہے، اسی طرح انسان بھی جب تک اپنے آپ کو مٹا نہیں دے گا، اس وقت تک امت کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

غصہ بہ قدرِ ضرورت ہو

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نصیحت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا تَغْضَبْ“ (غصہ مت کرو) ان صحابی نے دوبارہ نصیحت کی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَا تَغْضَبْ“ (غصہ نہ کرو) وہ صحابی تیسری مرتبہ بھی یہی درخواست کرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی یہی فرماتے ہیں: ”لَا تَغْضَبْ“ (غصہ نہ کرو)

(الصحيح للبخاري:٥٦٥١، الجامع للترمذي:١٩٤٣)

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلوان وہ نہیں جو لوگوں کو پچھاڑ دے، پہلوان تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ (الصحيح للبخاري:٥٦٤٩، الصحيح للمسلم:٤٧٣٣)

اس لیے غصے سے پرہیز کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے، تو بہ قدرِ ضرورت ہی غصہ ہونا چاہیے۔ میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں، دیکھو پریس (استری) میں ایک دو تین وغیرہ نمبرات لکھے ہوتے ہیں، جس سے پریس کو بہ قدرِ ضرورت گرم اور ٹھنڈی کرتے ہیں اور یہ الگ الگ قسم کے کپڑوں کے لیے الگ الگ ڈگری استعمال کی جاتی ہے اور اس کے خلاف کرنے سے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، اگر باریک کپڑے کو پریس کرنے لیے زیادہ گرم کر لیا جاے، تو کپڑا اجل جائے گا، اگر موٹے کپڑے کے لیے ہلکا گرم کیا جاے، تو پریس کا کوئی اثر نہیں ہوگا، اسی طرح غصہ بھی مغضوب علیہ کی حالت کے اعتبار سے ہونا چاہیے، پھر فرمایا: آئے دن طلاق و خلع کے واقعات وغیرہ اسی لیے رونما ہوتے ہیں کہ بے موقع شوہر غصہ ہو جاتا ہے یا بیوی غصہ ہو جاتی ہے، اگر غصہ بہ قدرِ ضرورت ہو تو یہ سارا فساد ختم ہو گا۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ غصے کے بارے میں تین باتوں پر غور کرنا ضروری ہے: ایک یہ کہ غصہ کب کیا جائے، دوسرے یہ کہ کیسا کیا جائے اور تیسرے یہ کہ کتنا کیا جائے؟

کب کیا جائے؟ جب شریعت اس کی اجازت دے؛ لہٰذا اگر شریعت کی اجازت کے بغیر غصہ کیا جائے گا تو گناہ لازم آئے گا۔ کیسا کیا جائے؟ یعنی کس طریقے پر غصے کا اظہار کیا جائے؟ گالی گلوچ نہ ہو، عار نہ دلائی جائے، غصے میں آکر اول فول نہ بکے۔ بعض لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ضرورت پر غصہ کیا جا سکتا ہے تو اس کا خیال نہیں کرتے کہ غصہ کس طرح کرنا چاہیے، اس کے کیا حدود ہیں؟ اور کتنا کیا جائے؟ اس کے بارے میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جس طرح پریس کرنے میں کپڑوں کی مختلف قسموں کا لحاظ رکھ کر اس کے موافق اس کو گرم کرنا چاہیے، اسی طرح کسی کو ایک ڈگری غصے کی ضرورت ہے، تو اسی قدر غصہ کرے اور کسی کے لیے دو

ڈگری کی ضرورت ہے تو دو ڈگری استعمال کرے، اس سے زائد غصہ کرے گا تو یہ ناجائز بھی ہوگا اور بے فائدہ بھی۔

اپنے نفس کے لیے غصہ نہ کرے

پھر فرمایا کہ کوئی بھی اپنے ماتحت لوگوں پر غصہ کرے تو اپنے نفس کے لیے نہ کرے؛ بل کہ اُسی کے فائدہ کے لیے ہونا چاہیے۔ جیسے اُستاذ کسی طالب علم کی اصلاح کے لیے غصہ کرتا ہے، یہ طالب علم کے فائدے کے لیے ہو، اپنے نفس کے لیے نہ ہو اور اُس کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً اُستاذ کسی طالب علم پر غصہ ہوا، متصلاً بعد کوئی دوسرا طالب علم اُس اُستاذ کے پاس کسی ضرورت سے جائے تو اُستاذ اُس پر بھی خواہ مخواہ غصہ ہو جائے تو یہ اپنے نفس کے لیے غصہ ہوا، نہ کہ اصلاح کے لیے، غصہ صرف اُسی پر ہونا چاہیے جو غلطی کرے، پھر دوسروں سے بات کرے تو نرمی برتے، پھر فرمایا ''یہ لوہے کے چنے چبانے سے زیادہ مشکل ہے''۔

غصے کی بھی ضرورت ہے

فرمایا: جب یہ کہا جاتا ہے کہ غصہ نہ کرو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلافِ شریعت یا خلافِ فطرت چیزیں دیکھنے کے بعد بھی بالکل غصہ نہ کیا جائے؛ بل کہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے تو یہاں تک فرمایا ''ہر موقعہ جس کو غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے'' لہٰذا غصہ فی ذاتہ ممنوع نہیں؛ بل کہ حد سے زیادہ یا بے موقعہ غصہ ممنوع ہے۔

بدگمانی کا موقعہ دینا بھی غلط ہے

فرمایا: جس طرح کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا جائز نہیں، اسی طرح بدگمانی کا موقعہ فراہم کرنا بھی جائز نہیں؛ مگر آج لوگ صرف بدگمانی کرنے کو غلط سمجھتے

ہیں، حال آں کہ بدگمانی کا موقعہ دینا اور زیادہ غلط بات ہے، پھر حضرت والا نے اس بات کو مدلل کرتے ہوئے بخاری شریف کی ایک حدیث بیان فرمائی: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں رمضان کے آخر عشرے میں اعتکاف میں تھے، آپ کی بیوی حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا آپ سے ملنے آئیں، کچھ دیر گفتگو کرنے کے بعد جانے لگیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑنے مسجد کے دروازے تک آئے، تو دو انصاری آدمی وہاں سے گذرے اور انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خبر دار! یہ صفیہ ہے (یعنی یہ گمان نہ کرو کہ کوئی دوسری عورت میرے پاس ہے؛ بل کہ یہ میری ہی بیوی صفیہ ہے) تو ان دونوں نے کہا کہ سبحان اللہ!! یارسول اللہ!! یعنی ہم آپ کے بارے میں کیسے بدگمانی کر سکتے ہیں اور ان پر یہ بات شاق گذری، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان انسان میں خون کی طرح دوڑتا ہے؛ اس لیے مجھے خوف ہوا کہ وہ کہیں تمھارے دل میں بدگمانی نہ پیدا کر دے۔

(الصحیح للبخاري:۱۸۹۳، الصحیح للمسلم:۴۰۴۱)

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ کی تفسیر

رمضان میں دورانِ تفسیر حضرت نے فرمایا: یہاں اس آیت میں علما سے مراد، وہ علما نہیں، جو کسی دینی ادارے کے سند یافتہ ہونے کی وجہ سے "مولوی" کہلاتے ہیں، اس لیے کہ نزولِ قرآن کے وقت نہ یہ مدارس تھے، نہ سندیں تھیں، نہ دستاریں تھیں، نہ دستار بندیاں ہوتی تھیں؛ اس لیے اس آیت میں علما سے مراد یہ لوگ نہیں ہیں؛ بل کہ مراد اللہ کو جاننے والے ہیں، جن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

" إِنَّمَا الْفَقِيْهُ الزَّاهِدُ فِيْ الدُّنْيَا ؛ الْبَصِيْرُ بِدِيْنِهٖ ؛ الْمُدَاوِمُ عَلٰى عِبَادَةِ رَبِّهٖ. "(فقیہ یعنی عالم وہ ہے، جو دنیا سے زہد اختیار کرے اور اپنے دین میں بصیرت رکھے اور اپنے رب کی عبادت پر دوام و پابندے رکھے)

حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کی ایک بات یاد آ گئی،" تاریخ بغداد" میں آپ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

" إِنَّمَا الْعِلْمُ لِيَتَّقِيَ اللّٰهَ بِهٖ ، وَ يَعْمَلَ بِهٖ لِآخِرَتِهٖ ، وَ يَصْرِفَ عَنْ نَفْسِهٖ سُوْءَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ، وَإِلَّا فَالْعَالِمُ كَالْجَاهِلِ إِذَا لَمْ يَتَّقِ اللّٰهَ بِعِلْمِهٖ. "

(علم تو اس لیے ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے اور آخرت کے لیے عمل کیا جائے اور دنیا اور آخرت کی برائی کو دور کیا جائے ؛ ورنہ تو عالم جاہل کے مانند ہے، اگر وہ اللہ سے ڈرتا نہیں) (تاریخ بغداد:۲۱۳/۴)

لہٰذا جو بھی عالم باللہ ہوگا اور اللہ کا خوف رکھتا ہوگا، اگر چہ وہ عالم بالکتب نہ ہو، وہ اس آیتِ کریمہ کا مصداق ہوگا، ہاں! اگر کوئی عالم بالکتب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم باللہ بھی ہو تو نور علیٰ نور ہے۔

یہ ہے اصطلاحِ قرآن وسنت میں ''عالم'' کی تعریف، صرف مدرسے میں داخل ہوا اور تصدیق وسند لے کر آ گیا، تو وہ قرآن وحدیث کی زبان میں عالم نہیں ہو جاتا۔

لفظ ''مولوی'' کا معنیٰ

ہمارے حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ لفظ'' مولوی'' میں یائے نسبتی ہے۔ جیسے دہلوی: دہلی والا، بنگلوری: بنگلور والا، کرناٹکی: کرناٹک والا میں یا نسبت کی ہے۔ اب ''مولوی'' کے معنیٰ ہوں گے مولیٰ والا، اللہ والا؛ لہٰذا جو اللہ والا نہ

ہو، وہ مولوی ہرگز نہیں ہے۔

عبرت آموز حکایت

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ دو چور ایک گھر میں داخل ہوئے اور انھوں نے یہ طے کیا کہ جب گھر کا مالک روشنی کے لیے چقماق کو رگڑ کر روشنی جلائے گا، تو ان میں سے ایک انگلی رکھ کر اس کو بجھا دے گا اور یہ واقعہ اس زمانے کا ہے، جب کہ بجلی کا کوئی انتظام نہیں تھا، چقماق کے پتھر ہوتے تھے، جن کو ایک دوسرے پر رگڑتے تو آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو دو چوروں نے یہ طے کیا کہ ہم لوٹنا شروع کریں گے اور جب گھر والا جاگ کر، بیدار ہو کر، چقماق سے روشنی جلانا چاہے گا، تو ایسی صورت میں ایک چور صرف یہ کام کرے کہ جیسے ہی وہ آگ جلائے، اس پر ہاتھ رکھ دینا؛ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ چقماق کا پتھر کبھی جلنے کا نہیں اور اس وقت تک دوسرا چور سب لوٹ لے گا، چناں چہ ایسا ہی کیا اور گھر کو ان چوروں نے لوٹ لیا۔

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ نے کہا کہ شیطان نے بھی اسی طرح بعض سالکین کے دل پر انگلی رکھ دی ہے؛ تاکہ نور ختم ہو جائے، سالک اگر کوئی نیکی کر رہا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ چقماق کا پتھر رگڑ رہا ہے اور شیطان اس پر انگلی رکھ دیتا ہے، یہ انگلی وہی معصیت اور گناہ ہے، جب گناہ ہوتا ہے تو وہ نیکی کی روشنی بجھ جاتی ہے، سالک نے ''اللہ اللہ'' کی، تلاوت و ذکر کیا، شیطان نے فوراً ہی اس کی آنکھوں سے کسی عورت کو دکھا دیا اور اس کے عشق میں اس کو مبتلا کر دیا، دل میں گندے خیالات پیدا کر دیا، اسی طرح گناہوں میں عمر گذر گئی اور یہ شخص صاحبِ نسبت بن نہ سکا۔

واقعی بڑی عبرت کی بات ہے، ہر سالک کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، بعض سالکین رات دن خانقاہوں میں رہتے ہیں، اولیاء اللہ کی صحبت میں ہیں، ذکر

وتلاوت بھی کرتے ہیں؛ لیکن گناہوں سے نہیں بچتے اوران کا نورتام نہیں ہوتا اور یہ محروم رہ جاتے ہیں۔

گناہ زہریلا سانپ ہے

جو یہ چاہے کہ وہ اللہ والا بن جائے تو وہ گناہ سے ایسا بچے جیسا کوئی سانپ سے بچتا ہے، سانپ کو دیکھیے بڑا حسین وجمیل لگتا ہے، جو اس کے زہر سے واقف نہیں ہوتا، وہ اس پر ہاتھ رکھ دے گا کہ ماشاءاللہ! کتنا اچھا لگ رہا ہے؟! اس کو لے جا کر پالا کروں گا اور یہ اس کی جہالت ہے اور جو اس کے زہر سے واقف ہوتا ہے، وہ یہ کہے گا کہ اس سے بچو، دور بھاگو؛ کیوں کہ یہ دیکھنے میں جتنا خوبصورت ہے، اندر سے اتنا ہی زہریلا ہے؛ چناں چہ علمائے حیوانات نے لکھا ہے کہ جو سانپ جتنا زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، وہ اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے اور جو زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا، اس میں زہر بھی کم ہوتا ہے، ناگ سانپ کو دیکھ لیجیے کہ اس کا پھن زیادہ خوبصورت ہوتا ہے؛ مگر اس کا کاٹا ہوا زندہ نہیں بچتا، اس کا ایک ڈسنا انسان کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح گناہ کرنے میں بھی بہ ظاہر لذت ملتی ہے؛ مگر اس کا انجام بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ بزرگوں نے کہا کہ گناہ سے اس لیے بھی بچو کہ گناہ انسان کو اپنے محبوبِ حقیقی اللہ سے دور کر دیتا ہے، جب آدمی گناہ کرتا ہے، تو اس کی وجہ سے دوری پیدا ہو جاتی ہے اور جتنا زیادہ گناہ کرے گا اسی قدر دوری بھی زیادہ ہوگی۔

عبادت میں لذت کیوں نہیں آتی؟

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو عبادت کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے، عبادات کا مزہ اس کو آتا ہے، جس کا دل صحیح سالم ہو، کوئی بیماری کا شکار نہ ہو اور اس کے مزاج کے

اندر کوئی فتور نہ ہو۔ جیسے صحت مند انسان جب بریانی کھاتا ہے تو بریانی کا مزہ آتا ہے، حلوہ کھاتا ہے تو حلوے کا مزہ آتا ہے، کھارا کھاتا ہے تو کھارے کا مزہ آتا ہے، میٹھا کھاتا ہے تو میٹھے کا مزہ آتا ہے؛ لیکن جس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو جائے، صفرے کی بیماری یا اور کسی بیماری کی وجہ سے، تو اب وہ کھائے گا تو مزہ نہیں آئے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ بے شک مزہ نہ آنے کی کوئی وجہ ہوگی، کسی آدمی کو بریانی کھانے کے باوجود مزہ نہیں آئے تو کیا وہ ڈاکٹر کو نہیں بتائے گا؟ اسی طریقے پر جس آدمی کو ذکر و نماز میں مزہ نہیں آئے، تو اسے یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا دل بیمار ہے، گناہوں کی وجہ سے اس کی طبیعت میں فساد پیدا ہو گیا ہے؛ اس لیے مزہ نہیں آرہا ہے۔

ہاں! ایک بات اور سن لیں کہ مزہ نہ آئے تو اس کا علاج تو کرانا چاہیے؛ مگر عبادت نہیں چھوڑنا چاہیے، بعض لوگ مزہ نہ آنے پر عبادت ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں، یہ حماقت کی بات ہے۔ جیسے کسی کو بریانی کھانے میں مزہ نہ آئے تو علاج تو کرانا چاہیے؛ مگر یہ بے وقوفی نہیں کرنا چاہیے کہ کھانا ہی چھوڑ دے؛ ورنہ مر ہی جائے گا، اسی طرح اب عبادت جو ہو رہی ہے بلا مزہ ہی سہی، ہو تو رہی ہے اور اس کی وجہ سے ایمان کی رمق تو باقی ہے، اگر یہ بھی چھوڑ دے گا تو اس کے ایمان کا کیا ہوگا؟

مزہ نہ آئے تو دوا سمجھو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت مجھے ذکر و نماز میں مزہ نہیں آتا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی عبادت میں مزہ آئے تو غذا سمجھو اور مزہ نہ آئے تو دوا سمجھو اور اس کو کرتے رہو، اگر مزہ نہ آئے تو عبادت چھوڑنا نہیں چاہیے؛ بل کہ یہ سمجھ کر کرنا چاہیے کہ وہ دوا ہے۔ جیسے ٹانک (Tonic)

پینے سے کیا مزہ آتا ہے؟ گولی کھانے سے کیا مزہ آتا ہے؟ اور اگر انجکشن لینا پڑے تو اس میں چُرکا لگتا ہے، مزہ تو وہاں نہیں؛ لیکن بہ ہر حال لگانا ہی پڑتا ہے، اسی طرح اگر عبادات میں مزہ نہ آئے تو چھوڑنا نہیں چاہیے؛ بل کہ اس کو کرتے رہنا ہے۔

لیکن اتنی بات ہے کہ اس کا مزاج ٹھیک نہیں، اس کا کچھ علاج ومعالجہ کرنا چاہیے، پھر ذکر کی حلاوت ایک وقت دل میں اترتی چلی جائے گی۔ بزرگوں نے کہا کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل سے عبادت کی حلاوت کو چھین لیتے ہیں، یہ گناہ کا اثر اور اس کی خرابی ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو عبادت میں مزہ نہیں آتا، وہ دراصل گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے اسی حقیقت کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

لہٰذا آدمی گناہ کو چھوڑے، پھر جا کر نماز پڑھے اور اللہ کو پکارے، اب دیکھو! اس سجدے کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟! گناہ کر کے بھی دیکھ لو اور گناہ چھوڑ کے بھی دیکھ لو، فرق خود بہ خود معلوم ہو جائے گا۔

اللہ کے دو حق ہیں

فرمایا: اللہ کے دو حق ہیں: ''محبت اور عظمت'' محبت اللہ سے رکھنا تو فرض ہے، ساری دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہونی چاہیے، اسی لیے قرآنِ کریم میں ایک جگہ اللہ اور رسول کو محبت میں مقدم نہ رکھنے والوں پر وعید آئی ہے:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاءُ كُمْ وَأَبْنَاءُ كُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ

تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ.﴾ (التوبۃ:۲۴)

(آپ فرما دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نہ چلنے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں، تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے)

حکم سے مراد عذاب کا حکم ہے۔ معلوم ہوا اللہ ورسول کی محبت دنیا و مافیہا سے زیادہ ہونا ضروری ہے اور اس محبت کا ایک حق ہے اور وہ حق عبادت و اطاعت کرنا ہے؛ کیوں کہ محبوب کی اطاعت کے بغیر محبت کا دعویٰ بے کار ہے۔

حضرت وراق رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے:

تَعْصِي الْإِلٰهَ وَأَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهٗ
هٰذَا لَعَمْرِيْ فِي الْقِيَاسِ بَدِيْعٌ
لَوْكَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَأَطَعْتَهٗ
إِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُّحِبُّ مُطِيْعٌ

(خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ اس سے محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے، خدا کی قسم یہ تو عجیب ہے۔ اگر تیرے دعوئ محبت میں کوئی صداقت ہوتی تو تو اپنے خدا کی اطاعت وفرماں برداری کرتا؛ کیوں کہ اصول یہ ہے کہ کسی کو چاہنے والا اپنے محبوب کا مطیع وفرماں بردار ہوا کرتا ہے)

لہٰذا محبت کا حق یہ ہے کہ محبوب کی عبادت واطاعت کی جائے اور اللہ کا دوسرا حق ہے اللہ کی ''عظمت'' قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا قَدَرُوْا اللّٰهَ حَقَّ

قَدْرِہٖ﴾ (لوگوں نے اللہ کی اس طرح قدر وعظمت نہیں کی، جیسی قدر وعظمت کرنا چاہیے)اور فرمایا:﴿ وَ کَبِّرْہُ تَکْبِیْراً ﴾ (اللہ کی عظمت و بڑائی بیان کرو)

معلوم ہوا کہ اللہ کی عظمت کرنا، اس کا ایک حق ہے اور اس کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچ جائے، معصیت سے دور بھاگے، اس کی ناراضگی لانے والی کوئی بات نہ کرے، یہ اللہ کی عظمت وجلالت کا حق ہے اور جس نے معاصی و گناہ نہیں چھوڑے، اس نے اللہ کی عظمت کا حق ادا نہیں کیا؛ اس لیے اللہ کے دونوں حق ادا کر کے ولی اللہ بن جاؤ، اللہ کا ولی بننے کا یہ نسخہ ہے، اس کو محفوظ کرلو۔

دنیوی عیش میں سکون نہیں

ارشاد فرمایا کہ مزہ اور چیز ہے، دل کا سکون اور چیز ہے: ایک آدمی مزے اڑا رہا ہے؛ لیکن ضروری نہیں کہ دل کو سکون بھی ہو، شراب بھی ہے، کباب بھی ہے، شباب بھی ہے، مال و دولت اور دنیا کا عیش بھی ہے؛ لیکن اس کے دل سے پوچھیے کہ سکون بھی حاصل ہے؟

ابھی میں کرنول گیا تھا، وہاں میرا قیام ایک گھر میں تھا، جب میرے میزبان اس گھر میں لے کر گئے، تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا گھر ہے، بہت لمبا چوڑا ہے، ہر قسم کے راحت وسکون کے اسباب موجود ہیں۔ خیر اس کے بعد ناشتے کے لیے بہت لمبا چوڑا دستر خوان بچھایا گیا، ناشتے کے بعد انھوں نے اپنی کہانی سنانی شروع کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ گھر کا کوئی آدمی رات بھر نہیں سوتا، دن میں چین نہیں، رات میں نیند نہیں، اپنے حالات اور پریشانی کا انھوں نے مجھ سے ذکر کیا، جس کو سن کر بڑا افسوس ہوا!!۔ دیکھیے اسباب کتنے ہیں؟! مال کی فراوانی ہے، راحت کے سارے سامان بے تحاشا ہیں؛ لیکن سکون نصیب نہیں، سامنے یہ حالت اور اندرونی یہ حالت،

اسی کو میں نے کہا کہ مزہ اور چیز ہے، دل کا سکون اور چیز ہے، منھ میں کباب ہے، دل میں عذاب ہے، جس نے اللہ کو ناراض کر کے منھ میں کباب رکھ لیا، اللہ کے قہر وعذاب سے اس کے دل کا سکون غارت ہوگیا، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ منھ میں سوکھی روٹی ہو اور دل میں سکون ہو۔ یاد رکھو! گناہوں سے سکون نہیں مل سکتا، ہاں! تھوڑی دیر کے لیے مزہ مل سکتا ہے؛ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے مزہ اڑا لیں گے؛ کیوں کہ وہ بھی جانتے ہیں کہ گناہوں کا مزہ صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے؛ لیکن ایک دولت اللہ کے قرب کی ہے کہ جس کو مل جاتی ہے، وہ سوتا ہوا بھی چین پاتا ہے اور جاگتا ہوا بھی، بیماری میں بھی اور صحت میں بھی؛ اس لیے انسان کو اللہ کے قرب اور محبت کی تلاش میں لگ جانا چاہیے، اسی میں قلب کا سکون ہے۔

ایک طالبِ علم کا تقویٰ

ایک طالبِ علم کا قصہ سناتا ہوں، ایک جگہ پر ایک مسجد میں ایک طالب علم رہتا تھا، اس علاقے میں کوئی حادثہ ہوگیا، رات کا وقت تھا، تو ایک عورت اس مسجد میں گھس آئی، وہاں اس عورت نے دیکھا کہ ایک نوجوان مولوی صاحب ایک کونے میں مطالعے میں مصروف ہیں، اس عورت نے آ کر ان سے کہا کہ حالات باہر بہت خراب ہیں، امن وامان نہیں ہے، اب میں اپنے مقام پر جا نہیں سکتی؛ اس لیے اب میں یہاں رات گزارنے آئی ہوں؛ اس لیے رات یہاں گزارنے کی اجازت دیجیے۔ اب وہ کیسے انکار کر سکتے تھے؟ اجازت دے دی، اب وہ عورت ادھر کو بیٹھ گئی، دوسری طرف یہ مولانا مطالعے میں مصروف ہوگئے اور ان کے سامنے ایک چراغ جل رہا تھا، وہ طالبِ علم درمیانِ مطالعہ اپنی انگلی کو چراغ میں داخل کرتے اور نکالتے، پھر کچھ دیر مطالعہ کرتے اور پھر اپنی انگلی کو چراغ میں داخل

کرتے اور نکالتے، دوسری طرف یہ عورت اس منظر کو دیکھ رہی تھی کہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا کہ اپنے آپ کو جلا رہا ہے، آخر کیا قصہ ہے؟ یہاں تک کہ رات ختم ہو کر جب صبح ہوئی، تو وہ طالبِ علم مسجد کے باہر گئے، حالات کا مشاہدہ کرکے آئے اور اس عورت سے کہا کہ اب نماز کا وقت ہونے والا ہے، نمازی آنے والے ہیں، اس طرح اب تمھارا یہاں رہنا مناسب نہیں کہ لوگوں میں بدگمانی ہوگی، اب باہر کا راستہ صاف ہو گیا ہے، آؤ تم کو باہر تک چھوڑ آؤں۔

اس نے کہا جب راستہ صاف ہے تو جانے میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن جانے سے پہلے ایک سوال کا جواب چاہتی ہوں، سوال یہ کہ رات بھر آپ اپنی انگلی کو جلانے کی کوشش کیوں کرتے رہے؟ اس راز کو جب آپ بتائیں گے، تب میں یہاں سے جاؤں گی، انھوں نے کہا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس نے کہا: جب تک آپ اس راز کو نہیں بتائیں گے، میں یہاں سے جانے کی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بات دراصل یہ کہ تم جب یہاں آئیں تو میرے دل میں نفسانی خواہشات ابھرنے لگے اور مجھے بے چین کرنے لگے، میں نے فوراً اپنے دل کو کہا کہ اگر تو برا کام کرے گا، تو تجھے جہنم میں جلنا پڑے گا، اس سے پہلے دنیا کی آگ کا مزہ چکھ لے، میں اسے دنیا کی آگ کا مزہ چکھا رہا تھا اور اپنے نفس کو کہہ رہا تھا کہ اگر تجھ میں اس کو برداشت کرنے کی طاقت ہو، تو پھر آگے دیکھا جائے گا، غرض جب بھی میرا نفس گناہ کا تقاضا کرتا، تو میں اپنے نفس کو آگ کا مزہ چکھاتا تھا، اس طرح پوری رات گزری۔

طلبائے کرام غور کریں کہ یہ ہے تقوے کی زندگی، اس طرح اپنے آپ کو لذات اور خواہشات سے بچانا چاہیے۔

ظاہر باطن کا ترجمان ہوتا ہے

میری طالب علمی کے زمانے میں تھانہ بھون میں ایک بزرگ تھے، ہم لوگ جلال آباد سے تھانہ بھون، ان بزرگ سے ملنے جایا کرتے تھے، ان کا نام حضرت ''مولانا ظہور الحسن'' صاحب رحمہ اللہ تھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی خانقاہ میں وہ رہتے تھے، اب ان کے صاحب زادے ''مولانا نجم الحسن'' صاحب رہتے ہیں، تو کبھی کبھی فرصت ہوتی، تو ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے، ان کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نور ہے، جو ٹپک رہا ہے، چاہیں تو پکڑ لیں اور یہی کیفیت تھی حضرت مسیح الامت نور اللہ مرقدہ کی، دیکھنے میں معلوم ہوتا تھا کہ واقعی نور ٹپک رہا ہے، کوئی چیز لے جاؤ اور پکڑ لو، یہ اللہ والے اپنے باطن کو ہمیشہ گندگیوں سے صاف رکھتے ہیں، جس کی نورانیت چہرے سے معلوم ہو جاتی ہے اور اسی طرح کوئی چھپ کر گناہ کر کے آتا ہے، تو اس کے چہرے کی بے رونقی سے اس کے دل کی ترجمانی ہو جاتی ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی فراست

ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بازار میں ایک گناہ ہو گیا کہ نامحرم عورت پر نگاہ پڑ گئی، پھر وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے اور ان کی مجلس میں بیٹھ گئے، حضرت نے فرمایا کہ کیا حال ہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہوتا ہے اور وہ مجلس میں آ کر بیٹھ جاتے ہیں؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ حضرت! کیا جبرئیل اب بھی وحی لاتے ہیں؟! کیا نبوت ختم نہیں ہوئی؟! جبرئیل کی آمد و رفت کیا اب بھی باقی ہے؟! حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نہیں! نبوت کا دروازہ تو بند ہو گیا؛ مگر فراست کا دروازہ

ابھی کھلا ہوا ہے، مؤمن کی فراست دیکھ لیتی ہے کہ کس نے کیا گناہ کیا ہے۔

(تفسير القرطبي:۱۰/۴۴)

حضرت شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ کا ایک ارشاد

ایک بزرگ مدرسہ آئے تھے، انھوں نے ہمارے مرشد حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کی ایک بات بتائی کہ جن چیزوں سے نقصان ہوتا ہے، ان چیزوں سے جانور بھی بچتا ہے۔ مثلاً راستے میں اگر کوئی کتا یا بلی اور کوئی جانور بیٹھا ہوا ہو اور اگر گاڑی یا موٹر کار آجائے، تو وہ فوراً اُٹھ کر وہاں سے چلا جاتا ہے؛ کیوں کہ اسے یہ معلوم ہے کہ اگر یوں ہی بیٹھا رہا تو اسے نقصان ہوسکتا ہے، تو فرمایا کہ جب جانور اپنی ذات کو نقصان سے بچاتا ہے، تو کیا ایک مسلمان کو اپنے دین کی حفاظت کی خاطر گناہوں سے بچنا نہیں چاہیے؟ دین کی حفاظت کے لیے تو اس سے زیادہ بچنا چاہیے؛ تاکہ ایمان ضائع نہ ہوجائے اور اس کے لیے بہت اہتمام سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنا چاہیے۔

نفس کی اصلاح-ایک بزرگ کا قصہ

دہلی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ ایک بزرگ فجر کی نماز کے بعد سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور یہ کہنے لگے کہ ”تو میرا خدا نہیں، میں تیرا بندہ نہیں، پھر میں تیری کیوں مانوں؟“ دیکھنے والے لوگ کہنے لگے: یہ کافر ہوگئے، کسی نے کہا: پاگل ہوگئے۔ جب نماز کا وقت آتا تو یہ بزرگ اندر جا کر نماز پڑھتے اور باہر آکر بیٹھ جاتے اور پھر یہی بات کہنے لگتے، مغرب کے قریب ایک شخص وہاں سے گزرتا ہوا، ان کی بات سنا اور کھڑا ہوگیا اور پوچھا کہ حضرت! یہ ”تو“ کا مخاطب کون ہے؟ اور یہ بات آپ کس

سے کہہ رہے ہیں؟ اس پران بزرگ کو ہنسی آگئی اور کہنے لگے ''دہلی جیسے شہر میں ایک ہی عقلمند نظر آیا، کسی نے مجھے پوچھا ہی نہیں کہ میرے اس ''تو'' کا مخاطب کون ہے؟ اور میں کس سے یہ کہہ رہا ہوں؟ خود ہی سمجھ لیا کہ میں اپنے اللہ سے یہ بات کہہ رہا ہوں، حال آں کہ میں اللہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، پھر اس شخص سے کہنے لگے: ''تو نے بڑی عقلمندی کا کام کیا کہ مجھ سے پوچھ لیا، دراصل میرا مخاطب میرا نفس ہے اور میں نفس سے مخاطب ہوں کہ اے نفس! تو میرا خدا نہیں ہے، میں تیرا بندہ اور غلام نہیں ہوں؛ اس لیے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو خدا کی مانوں گا۔

اس نے کہا کہ یہ بات آپ کیوں فرما رہے تھے؟ اس پران بزرگ نے کہا کہ بات یہ ہے کہ آج فجر کی نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے نکل رہا تھا، تو نفس نے شدت سے تقاضا کیا کہ آج ناشتے میں حلوے پراٹھے کھلاؤ، تو میں نے اس سے کہنا شروع کر دیا کہ تو میرا خدا نہیں ہے اور میں تیرا بندہ نہیں ہوں؛ اس لیے میں تیری کیوں مانوں؟ میں تو میرے اللہ کی مانوں گا اور جب بھی وہ مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے، میں یہی جواب دیتا ہوں۔

یہ واقعہ بڑا عبرت انگیز ہے اور اصلاحِ نفس کی فکر کرنے والوں کو ایک عمدہ سبق فراہم کرتا ہے۔ بزرگانِ دین کہتے ہیں کہ ناجائز چیزوں میں بالکلیہ پرہیز کرنا چاہیے اور جو جائز چیزیں ہوں؛ مثلاً کھانے پینے کی حلال چیزیں، ان میں پابندی نہیں ہے؛ لیکن ان میں تقلیل اور کمی کرنا چاہیے کہ کبھی نفس کو دے دو، کبھی کہہ دو کہ بھائی! اب نہیں تب ملے گا، اس سے نفس کنٹرول میں رہے گا، اگر اس کی ہر جائز و حلال خواہش پوری کی گئی، تو وہ سر پر بیٹھ جائے گا۔

نفس کی چالیں

حضرت حکیم اختر صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے ارشاد فرمایا کہ نفس حسینوں سے نظر ملاتا ہے، کبھی شانِ رحمت سے اور کبھی شانِ غضب سے۔ مثلاً کوئی لڑکی مسکین و یتیم ہو اور وہ رو رہی ہے، تو جناب بھی رو رہے ہیں، اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، بہ صورتِ رحمت یہ بدنظری کا لعنتی کام کر رہا ہے، اسی طرح کبھی غصے میں بدنظری کا لعنتی کام کرتا ہے۔ مثلاً ہوائی جہاز میں ائر ہوسٹس سے جوس مانگا، لانے میں دیر کر دی یا کھانا اچھا نہیں ہے، ڈانٹ رہا ہے، غصے سے آنکھیں بھی سرخ ہیں؛ مگر اسے دیکھ بھی رہا ہے، تو یہ غصے میں بدنظری کر رہا ہے، اللہ سب کی حفاظت فرمائے، غصہ کر رہا ہے؛ مگر بدنظری سے اندر اندر مزے لے رہا ہے، نفس سے ہوشیار رہیے، اس کی چالوں میں نہ آیئے، نفس کی چالوں سے وہی بچ سکتا ہے، جس پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہو؛ اس لیے اللہ کی رحمت مانگتے رہنا چاہیے اور گناہ سے بچنے کا پورا پورا اہتمام ہو، اللہ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللہُ کی فراست

حضرت جنید بغدادی رَحِمَہُ اللہُ کے زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا، وہ یہ کہ ایک عیسائی اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے کہیں یہ حدیث پڑھ لی "اتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ" (مومن کی فراست سے ڈرتے رہو؛ اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے)۔

(الجامع للترمذي:۳۰۵۲، الطبراني في الأوسط:۳/۳۱۲)

تو یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ سب تو آنکھ سے دیکھتے ہیں، مؤمن فراست سے کیسے دیکھتا ہے؟ اور کیسے سمجھ میں آئے گی کہ فراست کیا چیز ہوتی ہے؟ بعض

چیزیں سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتیں، جب تک کہ خود پر نہیں گزرتیں، بس وہاں پر یا تو تقلید کرے اور مان جائے کہ ہاں بھائی ہوتا ہے، یا نہیں تو خود کو حاصل ہو تو وہ بات سمجھ میں آجائے۔ الغرض اس کو اس حدیث کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا، اس نے علما سے پوچھا کہ اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اس کو سمجھایا گیا؛ مگر اس کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا، تو اس کو کسی نے مشورہ دیا کہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے پاس چلا جا، وہ تجھ کو سمجھا دیں گے، چناں چہ وہ مسلمانوں جیسا لباس پہن کر جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے پاس گیا اور جا کر کہا: ''السلام علیکم'' حضرت نے کہا: ''هَدَاكَ اللّٰہ'' (اللہ تجھ کو ہدایت دے) اب بس وہیں پر ٹھٹک گیا کہ میں سلام کرتا ہوں، تو سب لوگ سلام کے جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہتے ہیں اور یہ حضرت ''هَدَاكَ اللّٰہ'' کہہ رہے ہیں، اس نے کہا کہ حضرت میں نے سلام کیا، آپ نے ''هَدَاكَ اللّٰہ'' کہا، سلام کا جواب نہیں دیا، کیا بات ہے؟ حضرت نے کہا: ''اتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤمِنِ فَإِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ'' (مؤمن کی فراست سے بچو؛ اس لیے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) اور کہا کہ تو تو عیسائی ہے اور مسلمانوں جیسا لباس پہن کر آیا ہے، یہی ہے فراست!! جس سے میں تجھے دیکھ رہا ہوں، اب اس کی سمجھ میں آیا کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔

نفس کی اصلاح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کا طریقہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ کے بارے میں بزرگوں سے سنا ہے کہ جب ان کا نفس کسی چیز کا تقاضا کرتا تو کہتے کہ دو رکعت نماز پڑھ لینا، پھر چائے پی لینا، اس طرح نفس کو جو وہ چاہتا دیتے نہیں تھے؛ تا کہ نفس ان کے کنٹرول میں رہے، اس طرح نہیں کیا گیا تو پھر وہ ہمارے اوپر سوار ہو جائے گا۔

حضرت رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا طریقۂ اصلاح

حضرت رشید احمد گنگوہی رَحِمَہُ اللّٰہُ کی خدمت میں ایک آدمی آیا اور بیعت کی درخواست کی، تو حضرت نے اُس کو بیعت کے بعد گناہوں سے توبہ کرائی کہ زنا نہیں کروں گا، چوری نہیں کروں گا، نماز کی پابندی کروں گا وغیرہ، جب بیعت ہوگئی، تو اس نے کہا: حضرت سب چیزوں سے آپ نے توبہ کرادی؛ مگر افیون سے توبہ نہیں کرائی، حضرت نے کہا: مجھے کیا خبر کہ تم افیون کھاتے ہو، پھر حضرت نے افیون سے بھی توبہ کرادی، پھر حضرت نے اس سے پوچھا کہ دن میں کتنی افیون کھاتے ہو؟ چوں کہ حضرت کی عمر کا اخیر زمانہ تھا، نابینا ہو چکے تھے، نظر نہیں آتا تھا، اس لیے اس سے فرمایا کہ میرے ہاتھ پر رکھ دو کہ اس کی مقدار معلوم ہو جائے، جب اس نے ایک مقدار آپ کے ہاتھ پر رکھی، تو حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی آدھی اتنی کھالینا؛ یہ اس لیے فرمایا؛ تاکہ نفس بعد میں مشکل میں نہ پڑ جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں؛ مگر وہ آدمی بڑا باہمت تھا، اس نے کہا کہ حضرت جب توبہ کرلی، تو اتنی اور اتنی کیا، میں نے سب سے توبہ کرلی، چناں چہ بالکل چھوڑ دیا، ایسے بھی اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیخ کو اصلاح میں کن کن باتوں کی لحاظ رکھنا پڑتا ہے؟

مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ کی کایا کب پلٹی؟

پیر شمس تبریزی رَحِمَہُ اللّٰہُ جو حضرت مولانا جلال الدین رومی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے شیخ تھے، اپنے زمانے کے بہت بڑے اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، بڑے صاحبِ کرامت بزرگ تھے، ان کی ایک کرامت یہ لکھی ہے کہ کبھی کبھی مچھلی کھالیا کرتے

تھے اور مچھلی پکڑتے اور سورج کے قریب اپنا ہاتھ لے جاتے اور وہ مچھلی سورج کی تپش سے بھن جاتی اور اس کو کھا لیا کرتے، اتنے بڑے صاحبِ کرامت بزرگ؛ لیکن ان کی پوری زندگی اس طرح گزری کہ وہ تو ''اللہ اللہ'' کرتے رہتے اور لوگ جو ان کو بزرگ مانتے تھے، وہ اس لیے ان کے پاس آتے تھے کہ حضرت! ہمارے لیے دعا کر دیجیے، فلاں مقدمہ چل رہا ہے، تجارت ٹھپ ہوگئی ہے وغیرہ وغیرہ، یعنی صرف دنیا کے لیے آتے، حتیٰ کہ حضرت کی عمر کا آخری زمانہ آ گیا، ایک دن بیٹھ کر آہ کرنے لگے اور کہنے لگے، اے اللہ! میرے سینے میں تیرے عشق کی جو آگ بھڑک رہی ہے، کوئی بندہ اسے لینے آج تک میرے پاس آیا نہیں، ایک عجیب جذبے کے ساتھ تڑپ کر کہا اور کہا: اے اللہ! میرے دنیا سے جانے کا وقت شاید قریب آ رہا ہے، اس سے قبل کہ میں دنیا سے جاؤں، کسی ایک کو تو میں تیری یہ محبت دے کر جاؤں، اس کا کوئی انتظام فرما۔ اللہ نے دعا قبول کی، اس کے بعد وہ ایک مرتبہ دریائے دجلہ کے کنارے ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے، اللہ کے ذکر میں زبان لبریز تھی۔

چلتے چلتے جب دوسرے کنارے پر دیکھا تو مولانا روم رحمۃ اللہ ٹہلنے کے لیے آئے ہوئے ہیں، اِدھر اِنھوں نے اُن کو دیکھا اور اُدھر اِن کو اُنھوں نے دیکھا، دل دل میں یہ کہا کہ اگر یہ بندہ مجھے مل جائے تو اس بندے کے دل میں اللہ کی محبت کی آگ منتقل کر دوں، اللہ نے فوراً دعا قبول کی، وہیں سے مولانا روم رحمۃ اللہ کے دل میں یہ بات آ گئی کہ ایک اللہ کا ولی یہاں آیا ہوا ہے، اس کی خدمت میں جا کر کچھ فیض حاصل کرنا چاہیے، انھوں نے دوسرے کنارے سے اس کنارے آ کر فیض حاصل کرنا چاہا، مولانا روم رحمۃ اللہ اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور وہ اس زمانے کے خوارزم مملکت کے بادشاہ کے نواسے تھے۔ جب وہ باہر نکلتے تھے، تو ان کے ساتھ ایک لشکر ہوتا تھا، بڑی شان و شوکت کے ساتھ سوار ہو کر نکلتے تھے، بڑے

بڑے علماء ان کی رکاب پکڑ کر چلتے تھے اور اس زمانے میں انھوں نے اپنے علم کا لوہا منوالیا، ہزاروں مناظرے ومباحثے کیے، بڑی بڑی تقریریں کیں، علم کی دنیا میں ان کا نام ایک روشن ستارے کے مانند مانا جاتا تھا، اب یہ ہوا کہ وہ اللہ کا بندہ اللہ کے عشق کی آگ لینے کے لیے ایک کنارے سے دوسرے کنارے آیا اور بیعت ہوگیا۔ مولانا روم رحمہ اللہ کہتے ہیں، جب تک شمس تبریزی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر میں نے بیعت نہیں کی اور جب تک ان کی جوتیاں سیدھی نہیں کی، مجھے علم کا چسکہ بھی نہیں معلوم ہوا، آج مجھے معلوم ہوا کہ علم کیا ہوتا ہے؟ اللہ کے عشق اور اس کی معرفت کے بغیر سب کچھ یوں ہی بے کار ضائع ہوتا ہے، نماز روزہ ودیگر عبادات میں وہ لذت نہیں ملتی، جو ان چیزوں سے حاصل ہوتی ہے، مولانا روم رحمہ اللہ کی طبیعت اسی وقت بدلنی شروع ہوگئی، مولانا روم رحمہ اللہ نے ''مثنوی شریف'' لکھی، ان کی کوئی کتاب مثنوی کے علاوہ دنیا میں مشہور نہیں ہے، حال آں کہ ان کی اور بہت ساری کتابیں ہیں؛ مگر اللہ نے مثنوی کو جو مقام دیا وہ کسی اور کتاب کو نہیں دیا، حتیٰ کہ بعض علما کہتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ یہ مثنوی درحقیقت فارسی کا قرآن ہے، قرآن کے تمام علوم واسرار، معارف ودقائق کو اس کے اندر کھول کھول کر بیان کردیا ہے، اتنا عظیم علم جو ان کو اللہ نے دیا، یہ دراصل شمس تبریزی رحمہ اللہ کی برکت تھی، ان کی جوتیوں کو سیدھا کرنے کا نتیجہ تھا، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دنیا والے دنیا مانگتے ہیں؛ لیکن اللہ والے، اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں، مولانا روم رحمہ اللہ نے اللہ مانگ لیا، جب اللہ مل گیا تو ان کی حالت تبدیل ہوگئی۔

آپ متقی کیسے بن سکیں گے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے عورتیں آتی ہیں، ہم کیا کریں؟

ہمارے سامنے برائی آتی ہے، ہم کیا کریں؟ میں کہتا ہوں کہ اگر برائی نہ آئے تو آپ متقی کیسے بن سکیں گے؟ اگر کوئی برائی نہ آنی ہوتی، تو پھر آپ جنت میں بیٹھے ہوتے، اور کوئی جنتی متقی نہیں، ہاں ہر متقی جنتی ہے، جنت کا رہنے والا متقی نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ جنت میں متقی بننے کے اسباب ہی نہیں ہیں، ہاں! جو دنیا میں رہ کر متقی بنا، وہ ضرور جنتی ہوگا؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَيْهِ السَّلَام کو دنیا میں بھیجا، اگر وہ جنت میں رہتے تو متقی نہیں بن سکتے تھے، اللہ نے ان کو جنت سے نکال کر دنیا میں بھیجا کہ جاؤ، دنیا میں مصائب و پریشانیاں آئیں گی، کوئی کانٹا دل میں، کوئی کانٹا ہاتھ پر، کوئی پیر میں لگے گا، ان تمام کانٹوں سے بچ کر زندگی گزارنے کا نام تقویٰ ہے، جو آدمی تقوے کی زندگی گزارے گا، وہ جنتی ہوگا، اگر کوئی اندھا یہ کہے کہ میں نے کبھی کسی عورت کو دیکھا ہی نہیں، تو اس میں اندھے کا کیا کمال ہے؟ اس لیے کہ وہ تو مفقود البصر (نابینا) ہے، دیکھنا چاہے تب بھی نہیں دیکھ سکتا، ہاں! کوئی بینا یہ کہے کہ میں نے کبھی غلط نگاہ نہیں ڈالی، کسی عورت کو نہیں دیکھا، تو یہ کمال ہوگا۔ جیسے فرشتوں کا گناہوں سے بچنا کمال نہیں؛ کیوں کہ ان میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، معلوم ہوا کہ گناہ کی صلاحیت ہونے کے باوجود جو بچ جائے وہ قابلِ مدح ہے۔

نفس کی اصلاح اعتدال کے ساتھ ہونی چاہیے

ایک دم نفس پر کنٹرول نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ اس کو شیخ کی رائے سے روک تھام کرنا چاہیے؛ ورنہ نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا، ایک آدمی کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس کا مالک جب اس کو سفر میں لے کر نکلتا، تو اس کی ایک بری عادت یہ تھی کہ لید کرنے کے بعد، گھوم کر اس کی بدبو سونگھتا اور پھر آگے بڑھتا، یہ شخص

اس کی اس حرکت سے بہت تنگ تھا، ایک دن اس آدمی کو کسی سفر پر جانا تھا، اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر سفر پر نکلا، راستے میں اس گھوڑے نے اپنی وہی حرکت شروع کردی، مالک کو بڑی پریشانی ہونے لگی، لمبا سفر تھا، اس طرح یہ کرے گا تو پریشانی ہوگی، چلتے چلتے راستے میں ایک اور گھوڑ سوار سے ملاقات ہوگئی، دونوں باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، ایک جگہ اس گھوڑے نے وہی پرانی حرکت کی، تو دوسرے گھوڑے والے نے پوچھا کہ یہ کیا قصہ ہے تمھارے گھوڑے کا؟ کہا کہ میرے گھوڑے میں یہ عادت پیدا ہوگئی ہے، جس سے میں بہت پریشان ہوں، اس نے کہا کہ اس گھوڑے کا علاج میں کرتا ہوں، آپ میرے گھوڑے پر سوار ہوجایئے اور اپنا گھوڑا مجھے دے دیجیے، چناں چہ ادل بدل کر کے سفر شروع کردیا، جب وہ دوبارہ راستے میں لید کر کے اپنی پرانی حرکت کرنے لگا، تو اس آدمی نے گھوڑے کی اس قدر پٹائی کی کہ گھوڑے کو بھی عقل آگئی، ایک ہی دفعہ کی پٹائی میں ٹھیک ہوگیا، بہت دور سفر کرنے کے بعد دونوں کی راہ الگ ہو رہی تھی، پھر دونوں نے اپنا اپنا گھوڑا بدل لیا اور اس دوسرے شخص نے کہا کہ بھائی! اب تمھارا گھوڑا ٹھیک ہوگیا، لے کر جاؤ، یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا، دونوں کا راستہ الگ ہوگیا اور کچھ دیر گزر گئی، جب اس گھوڑے کو خوب یقین ہوگیا کہ وہ دوسرا گھوڑ سوار ہم سے دور چلا، تو وہ گھوڑا وہاں سے مڑا اور پورا راستہ جہاں جہاں لید کیا تھا، وہاں وہاں واپس جا کر ہر جگہ سونگھ آیا۔

اس میں عبرت ہے کہ نفس کو کنٹرول کرنے کے لیے اعتدال کی ضرورت ہے، اگر ایک دم سیدھا کردیا جائے، تو فی الوقت تو وہ سدھر جائے گا؛ مگر جب دوبارہ لوٹے گا، تو ایسا لوٹے گا کہ کفر کی طرف بھی جا سکتا ہے، اللہ حفاظت فرمائے۔

تقویٰ کسے کہتے ہیں؟

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بتاو! تقویٰ کسے کہتے ہیں؟ تو انھوں نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین! کیا آپ کا گزر کبھی ایسے راستے سے ہوا ہے؟ جو تنگ ہو، اِدھر اُدھر کانٹے دار جھاڑیاں ہوں، چلنا دشوار ہو، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں ایسی جگہ سے گزر ہوا ہے، تو انھوں نے پوچھا کہ آپ جب اس راستے پر سے گزرے تھے تو کیسے گزرے تھے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اس طرح گزرا تھا کہ اپنا دامن سمیٹ لیا تھا، اپنے آپ کو بچا کر بہت ہی احتیاط سے گزرا تھا، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بس اسی کا نام تقویٰ ہے؛ کیوں کہ دنیا بھی کانٹوں بھرا راستہ ہے، کہیں بدنظری کے مواقع ہیں، تو کہیں کانوں سے گانوں کی آواز ٹکرا رہی ہے، کہیں کفر کے کانٹے ہیں، کہیں شرک و نفاق کے کانٹے ہیں، یہ سب روحانی کانٹے ہیں، ان سب سے بچ کر چلنے کا نام تقویٰ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱)

اسی مفہوم کو عربی شاعر ''ابن المعتز'' نے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

خَلِّ الذُّنُوْبَ کَبِیْرَهَا ، وَ صَغِیْرَهَا فَهُوَ التُّقٰی
وَاصْنَعْ کَمَاشٍ فَوْقَ أَرْضِ الشَّوْکِ یَحْذَرُ مَایَرٰی
لا تَحْقِرَنَّ صَغِیْرَةً ؛ إنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحِصٰی

(چھوٹے بڑے سب گناہ چھوڑ دو، یہی تقویٰ ہے اور کانٹوں دار زمین پر چلنے والے کی طرح ہر اس چیز سے احتیاط کرو جو نظر پڑے۔ چھوٹے گناہ کو بھی حقیر نہ سمجھو؛ کیوں کہ پہاڑ چھوٹی چھوٹی کنکریوں ہی سے بنتا ہے۔)

سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے-ایک عجیب قصہ

مولانا رومی رحمۃ اللہ نے سلطان محمود غزنوی کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، جو بڑا عبرت خیز وسبق آموز ہے، وہ یہ کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں چوروں کا کچھ زور ہو گیا تھا اور بادشاہ اس کی وجہ سے پریشان ہوا اور چوروں کو پکڑنے کے لیے ایک عجیب تدبیر نکالی کہ شاہی لباس اُتار کر چوروں کا سا پھٹا پرانا لباس پہن لیا اور شہر میں گشت کرنے لگا، ایک جگہ پر دیکھا کہ بہت سے چور اکھٹے بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے ہیں، بادشاہ بھی ان میں بیٹھ گیا، چوروں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ بادشاہ نے کہا کہ میں بھی تم جیسا ہوں، چوروں نے سمجھا کہ یہ بھی کوئی چور ہے، انھوں نے کہا کہ تم اپنا کوئی ہنر بتاؤ، اگر تمھارے اندر کوئی ہنر ہوگا، تو تم کو اپنے ساتھ شریک کرلیں گے؛ ورنہ نہیں، بادشاہ نے کہا: پہلے آپ لوگ اپنا اپنا ہنر بتاؤ، پھر میں اپنا ہنر بتاؤں گا، ایک چور نے کہا کہ میں اونچی سے اونچی دیوار پھاند کر مکان میں داخل ہو جاتا ہوں، اگر چہ بادشاہ کا قلعہ ہی کیوں نہ ہو؟! دوسرے نے کہا کہ میری ناک کی یہ خاصیت ہے کہ کسی جگہ کی مٹی سونگھ کر بتا دیتا ہوں کہ یہاں خزانہ ہے یا نہیں؟ تیسرے چور نے کہا کہ میرے بازو میں اتنی طاقت ہے کہ میں گھر میں گھسنے کے لیے اس میں سوراخ کرسکتا ہوں، چوتھے چور نے کہا کہ میں ماہر حساب ہوں، Phd کیا ہوا ہوں، کتنا ہی بڑا خزانہ کیوں نہ ہو، چند لمحوں میں حساب لگا کر تقسیم کر دیتا ہوں، پانچویں چور نے کہا کہ میرے کانوں میں ایسی خاصیت ہے کہ میں کتے کی آواز سن کر بتا دیتا ہوں کہ کتا کیا کہہ رہا ہے، چھٹے چور نے کہا کہ میری آنکھ میں یہ خاصیت ہے کہ جس چیز کو رات میں دیکھ لیتا ہوں، دن میں اس کو پہچان لیتا ہوں، اب بادشاہ نے کہا کہ میری ڈاڑھی میں یہ خاصیت ہے کہ جب مجرمین کو پھانسی کے لیے جلاد کے

حوالے کیا جاتا ہے، اس وقت اگر میری ڈاڑھی ہل جاتی ہے، تو مجرمین پھانسی کے پھندے سے بچ جاتے ہیں، چوں کہ وہ بادشاہ تھا، اس نے ایک خاص لطیف انداز سے اپنا ہنر اور کمال بیان کیا، سارے چور یہ بات سن کر خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ تو چوروں کے قطب ہیں، جب ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے، تو آپ ہی کے ذریعے ہم کو خلاصی مل سکتی ہے۔

پھر سب نے مشورہ کیا اور طے کیا کہ آج بادشاہ کے یہاں چوری کی جائے، اس لیے کہ آج مصیبت سے چھڑانے کے لیے، ڈاڑھی والا بھی موجود ہے؛ لہٰذا سب کے سب بادشاہ کے محل کی طرف چل پڑے، راستے میں کتا بھونکا، تو کتے کی آواز پہچاننے والے نے کہا کہ کتا کہہ رہا ہے کہ بادشاہ تمہارے ساتھ ہے؛ لیکن چور پھر بھی چوری کے ارادے سے باز نہ آئے اور بادشاہ کے یہاں چوری کر ڈالی اور خزانہ لوٹ لیا اور جنگل کی طرف آئے اور وہاں بیٹھ کر ماہر حساب نے حساب لگا کر چند منٹوں میں سب کو تقسیم کر دیا، بادشاہ نے کہا: سب لوگ اپنا پتہ لکھوا دو؛ تا کہ آئندہ چوری کرنا ہو، تو ہم سب لوگ آسانی سے جمع ہو سکیں، سب کا پتہ نوٹ کر لیا گیا اور سب نے اپنا اپنا راستہ لیا، اگلے دن بادشاہ نے عدالت لگوائی اور پولس کو حکم دیا کہ سب کو پکڑ کر لاؤ، جب سب چور ہتھکڑیاں ڈال کر حاضر کیے گئے، بادشاہ نے سب کو پھانسی کا حکم دے دیا اور کہا کہ اس مقدمے میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ سلطان خود وہاں موجود تھا۔

یہاں ایک بات ضمناً عرض کرتا ہوں کہ اسی طرح قیامت کے دن اللہ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہوگی؛ اس لیے کہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (تم جہاں بھی ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے) اگر تم دو ہو تو تیسرا خدا ہے، چار ہو تو پانچواں خدا ہے، جب تم بدکاریاں کرتے ہو، تو اللہ سب دیکھتا ہے، اللہ کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں، اس کے

باوجود قیامت کے دن بندوں پر اتمام حجت کرنے کے لیے ہاتھوں اور پیروں کی، فرشتوں کی اور صحیفۂ اعمال کی گواہی ہوگی۔

الغرض جب چھ کے چھ چور پھانسی کے تختے پر کھڑے ہوگئے، تو وہ چور جو آنکھوں کی خاصیت والا تھا، اس نے بادشاہ کو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے، جو رات ہمارے ساتھ تھا، وہ تختۂ دار سے چلایا کہ حضور کچھ دیر کے لیے امان دی جائے، اور آپ سے تنہائی کا موقعہ دیا جائے، بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے، تھوڑی دیر کے لیے پھانسی کو موقوف کر دو اور اس کو میرے پاس بھیج دو، اس نے حاضر ہو کر عرض کیا ''ہر یکے خاصیت خود را نمود'' (ہر ایک نے اپنی خاصیت بتادی) ہر ایک نے اپنا ہنر بتادیا، ہمارے وہ ہنر جن پر ہم کو ناز تھا، انھوں نے ہماری بدبختی کو اور بڑھایا کہ آج ہم تختۂ دار پر ہیں، اے بادشاہ! میں نے آپ کو پہچان لیا ہے کہ آپ نے وعدہ فرمایا تھا، جب مجرموں کو تختۂ دار پر چڑھایا جاتا ہے، اگر اس وقت میری ڈاڑھی ہل جاتی ہے، تو مجرمین پھانسی سے نجات پاجاتے ہیں؛ لہٰذا آپ اپنے ہنر کو ظاہر فرمائیں؛ تاکہ ہماری جان خلاصی پائے، سلطان محمود نے کہا: تمھارے ہنروں نے تو تمھیں مبتلائے قہر کردیا ہے؛ لیکن یہ شخص جو سلطان کا عارف ہے، اس کی چشمِ سلطاں شناس کے طفیل میں، تم سب کو رِہا کیا جاتا ہے۔

اس عجیب وغریب قصے کو بیان کر کے مولانا روم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص اپنے ہنر پر ناز کر رہا ہے، بڑے بڑے اہل ہنر اپنی بدمستیوں میں مست اور خدا سے غافل ہیں؛ لیکن کل قیامت کے دن، ان کے یہ ہنر کچھ کام نہ آئیں گے؛ بل کہ یہی دنیوی ہنر، ان کو مبتلائے قہر وعذاب کردیں گے اور اس کے برخلاف جن لوگوں نے اس دنیا کے اندھیرے میں اپنے حقیقی بادشاہ اللہ عزوجل کو پہچان لیا اور اس کی

معرفت اپنے دلوں میں پیدا کر لی، قیامت کے دن یہ خود بھی نجات پائیں گے اور ان کی سفارش گنہ گاروں کے حق میں قبول کی جائے گی۔

یاد رکھو کہ دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچاننے کا ہنر سیکھ لیا، تو پھر دوسرے ہنر سیکھنا کچھ مضر نہیں؛ کیوں کہ پھر کوئی بھی ہنر آپ کو اللہ سے غافل نہیں کر سکتا، ڈاکٹر، انجینئر بننا منع نہیں ہے، بہ شرطیکہ آپ اللہ سے غافل نہ ہوں۔ اس حکایت سے معلوم ہوا کہ چشمِ سلطاں شناس ہی کام آئی، باقی ہنر تختہ دار پر لے گئے، اسی طریقے پر دنیا کے تمام کاروبار جو اللہ سے غافل ہو کر کیے جاتے ہیں، وہ آخر کار انسان کو تباہی و بربادی میں ڈال دیتے ہیں؛ لیکن جب کوئی شخص اللہ کی معرفت کا نور حاصل کر لیتا ہے اور وہ اللہ سے غافل ہونے کے بہ جائے، اللہ کا عاقل بن جاتا ہے، تو وہ شخص خود بھی نجات پاتا ہے، دوسروں کو بھی نجات دلانے کا ذریعہ بن جاتا ہے؛ اس لیے سب سے بڑی چیز اللہ کی معرفت ہے۔

اللہ کے بارے میں باخبر سے پوچھو

اللہ کی ذات کو پہچاننا بہت آسان ہے، اس کی صفات کے ذریعے، اس کے افعال کے ذریعے، جو اللہ کی طرف سے ہم کو روزانہ دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کبھی بارش ہو رہی ہے، کبھی گرمی پڑ رہی ہے، کبھی سیلاب آ رہا ہے، کہیں عذابات کا سلسلہ جاری ہے، کوئی بیمار ہو رہا ہے، کوئی شفایاب ہو رہا ہے، کسی کی موت ہو رہی ہے اور کسی کی پیدائش ہو رہی ہے؛ یہ ساری چیزیں اللہ کی معرفت کے ذرائع و وسائل ہیں، آدمی کو اس میں غور و فکر کے نتیجے میں اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے، اللہ سے ہم وہ آنکھ مانگیں، جو اس دنیا کے اندھیرے میں اللہ کو پہچان لے، قیامت کے دن یہی آنکھ باعث نجات ہوگی۔

اللہ کو کس طرح پہچانیں؟ اس کا طریقہ خود اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا﴾ (رحمٰن کو جاننے کے لیے ان بندوں کے پاس جاؤ، جو رحمٰن سے باخبر ہیں) حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''رحمٰن کے بارے میں کسی باخبر سے پوچھو'' اگر کسی جاہل سے جا کر پوچھو گے، تو وہ کیا بتائے گا۔ جیسے کسی نے اپنے زمانے کے بادشاہ کے بارے میں کہا تھا کہ ہمارا بادشاہ تو اتنا بڑا ہے، اتنا بڑا ہے کہ دس ہاتھیوں کے برابر ہے، اس بے وقوف کی نظر میں ہاتھی بڑا جانور تھا، اس نے پھر قیاس کیا، اندازہ لگایا ہوگا کہ جب ہاتھی اتنا بڑا ہے تو ہمارا بادشاہ دس ہاتھی کے برابر ہوگا؛ ورنہ وہ ہاتھی سے چھوٹا رہ جائے گا، جو اس کی شان سے گری ہوئی بات ہوگی۔

مگر حقیقت میں یہ تو بے وقوفی ہوئی اور اس کی بے وقوفی نے بادشاہ کے لیے ایسی بے تکی بات نکلوا دی؛ اس لیے کسی باخبر سے معلوم کرو کہ اللہ کیا ہے؟ '' خبیراً '' کی تفسیر علامہ آلوسی رَحِمَہُ اللہُ نے کی ہے '' اَلْمُرَادُ فَاسْئَلْ عَارِفاً يُخْبِرُكَ'' ''خبیراً '' سے مراد عارفین ہیں، اللہ کو پہچاننے والے اور ان کی صحبت کی برکت ہی اللہ کی معرفت کا ذریعہ بنتی ہے۔ (تفسير روح المعاني:۱۹/۳۹)

دنیا کی حقارت-ایک عمدہ مثال

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم عَلَیْہِ السَّلَامُ کو شجرۂ ممنوعہ کھانے کی وجہ سے دنیا میں اس لیے بھیج دیا تھا کہ اُس پھل کو کھانے کے بعد قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئی اور پیٹ میں ہل چل مچ گئی، بے چینی و بے قراری بڑھ گئی؛ مگر جنت میں بیت الخلا نہیں ہے، اس کی فیسیلیٹی (Facility) وہاں نہیں ہے؛ اس لیے کہ جنت تو پاکیزہ مقام ہے اور اللہ نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہاں قضائے حاجت کی ضرورت ہی

نہیں پڑے گی اور جو بھی کھائیں گے وہ ہضم ہو جائے گا، اللہ نے وہاں کی غذاؤں میں فضلہ نہیں رکھا ہے۔ الغرض حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا کہ جنت کا بیت الخلا تو دنیا ہے؛ اس لیے آپ جنت سے دنیا میں چلے جاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اور ان کی وجہ سے ان کی ذریت کو دنیا میں حاجت پوری کرنے بھیجا گیا تھا؛ کیوں کہ جنت میں اس کا انتظام نہیں تھا۔

اس کے بعد حضرت والا نے چند نصیحت آمیز باتیں بیان فرمائیں:

۱- جس جنت کا بیت الخلا (دنیا) ایسا ہو، جس میں ہرے بھرے باغات بھی ہیں، عمدہ قسم کے محلات بھی ہیں، جس میں بلند پہاڑ بھی ہیں، تو اس جنت کا کیا حال ہوگا؟!! وہاں کے باغات کا کیا عالم ہوگا؟!! وہاں کے محلات کیسے ہوں گے؟!! لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس ناپاک دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑے؛ بل کہ جنت جیسی حسین چیز کی طلب میں کوشاں رہے۔

۲- بیت الخلا سے انسان بہ قدر ضرورت ہی استفادہ کرتا ہے یعنی جس وقت تقاضا ہو، اُسی وقت جاتا ہے اور ضرورت پوری ہونے کے فوراً بعد واپس آجاتا ہے، اسی طرح انسان کو دنیا (جو جنت کا بیت الخلا ہے) کے مال ومتاع، آل واولاد سے انتفاع بھی ضرورةً اور بہ قدر ضروت ہی کرنا چاہیے، معلوم ہوا جو انسان دنیا کی چیزوں میں اس طرح مگن ہو جاتا ہے کہ اسے آخرت کی تیاری کی فکر ہی نہ ہو، تو وہ ایسا ہی ہے، جیسے کوئی بیت الخلا میں جا کر اُسی کو سب کچھ سمجھ لے اور دوسری عمدہ چیزوں سے غافل ہو جائے۔

۳- جتنا وقت انسان کا بیت الخلا میں قضائے حاجت کے لیے صرف ہوتا ہے یعنی پانچ یا دس منٹ، انسان کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں اس کی حیات بھی اسی قدر قلیل

ہے۔

۴- بیت الخلا میں جا کر کوئی بھی انسان وہاں عیش وعشرت کی تمنا نہیں کرتا؛ بل کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً چلا آتا ہے اور اگر کوئی یہ خواہش کرنے لگے، تو سب اس کو احمق و پاگل کہیں گے، اسی طرح دنیا (جو کہ جنت کا بیت الخلا ہے) میں بھی عیش وعشرت کی تمنا کرنا، بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

شیطان کی دعا بھی قبول ہوئی

فرمایا: انسان چاہے جتنے بھی گناہ کر لے؛ مگر ایک بار وہ دربارِ الٰہی میں آ کر سر بہ سجود ہو کر سچی توبہ کر لے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُس کی بھی سنی جائے گی، پھر فرمایا شیطان نے عجیب وغریب موقعے پر عجیب دعا کی، اُس وقت دعا مانگی، جب کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی نافرمانی (آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے) کی وجہ سے شیطان لعین پر نہایت غضب ناک تھے اور دعا مانگی بھی تو ایسی عجیب کہ کوئی ایسی دعا نہیں مانگتا، اس نے دعا یہ کی: ﴿قَالَ رَبِّ أَنْظِرْنِي إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ (اے اللہ! مجھے قیامت تک مہلت عطا فرما!) (الحجر: ۳۶)

غور کرنے کی بات ہے کہ ایسی دعا کو بھی تعالیٰ نے ایسے غضب ناک ہونے کے باوجود شیطان جیسے نافرمان کے حق میں قبول فرمائی، تو کیا انسانوں میں سے کوئی اس خالق سے مانگے تو شنوائی نہیں ہوگی؟ کیوں نہ ہوگی؟ ضرور ہوگی؛ اس لیے اللہ سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔

غیر مستند واعظ سے احتراز کرو

ایک مرتبہ بنگلور میں ڈاکٹر ذاکر نائک صاحب کا خطاب تھا، تو ایک صاحب

(جو حضرت والا سے اصلاحی تعلق رکھتے ہیں) ان کے خطاب میں شرکت کرنے کی اجازت چاہی، تو حضرت نے پوچھا کہ ان کے خطاب میں کیوں جانا چاہتے ہو؟ تو انھوں نے کہا کہ حضرت! وہ بعض اشکالات جو اسلام پر کیے جاتے ہیں، ان کے جوابات دیتے ہیں، اس پر حضرت والا نے فرمایا: اگر تم وہاں گئے اور اعتراض وجواب سنے، بالفرض کسی اعتراض کے جواب سے جو انھوں نے دیا ہے، تمھیں تشفی نہ ہوئی، تو تم خواہ مخواہ دل میں اسلام کے خلاف اعتراض لیے رہوگے، اس کی کیا ضرورت ہے؟! اللہ نے تمھارے دل کو اسلام سے مطمئن رکھا ہے، اس کا شکر کرو!!

اس کی مثال ایسی ہے جیسے اگر کوئی کہے کہ ایک صاحب ہیں، جن پر کچھ لوگ پتھراؤ کرتے ہیں اور وہ صاحب اس کا بچاؤ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ اس کو دیکھنے جمع ہوتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس بچاؤ کو دیکھنے جانا حماقت ہے؛ کیوں کہ اگر خدا نہ خواستہ کوئی پتھر ان دیکھنے والوں کو لگ گیا، جن کو بچاؤ کی یہ تدبیر نہیں آتی، تو خواہ مخواہ ہلاکت میں پڑنا ہوا اور یہاں تو جان کی ہلاکت ہے اور ان مجالس میں جانے سے ایمان کی ہلاکت کا ڈر ہے کہ کوئی شبہ دل میں گھر کر گیا اور ایمان رخصت ہوا۔

اسی لیے اس طرح کی مجالس نہ صحابہ کے زمانے میں ہوتی تھیں اور نہ اس کے بعد کے دوروں میں سلف سے ثابت ہیں، اگر کسی کو اشکال ہو تو اس کا جواب اسی کو دیا جانا چاہیے، نہ یہ کہ جن کو اشکال نہیں ہے ان کو بھی خواہ مخواہ اشکالات سنائے جائیں۔

اللہ کی نعمت کا اندازہ کرو-ایک بزرگ کا قصہ

ایک بادشاہ نے کسی بزرگ سے نصیحت کرنے کی درخواست کی، تو انھوں نے پوچھا کہ اگر تمھیں سخت پیاس لگے اور پانی میسر نہ آئے، جان جانے کا اندیشہ ہو، ایسے وقت میں اگر کوئی کہے کہ ایک گلاس پانی میں دیتا ہوں اور تمھاری آدھی سلطنت

اس کے عوض میں دینا پڑے گا، تو تم کیا کروگے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے کر ایک گلاس پانی لے لوں گا؛ تا کہ جان بچے۔

ان بزرگ نے پھر پوچھا کہ اگر خدانہ خواستہ اس پانی کے پینے کے بعد تمھارا پیشاب بند ہو جائے اور اطبا کہیں کہ اس کا علاج ہو سکتا ہے، اگر آدھی سلطنت اس کے عوض میں ہمیں دے دو گے، تو علاج کر کے پیشاب جاری کریں گے، تم کیا کرو گے؟ بادشاہ نے کہا کہ آدھی سلطنت دے دوں گا اور علاج کراؤں گا؛ تا کہ جان بچ جائے ، تو اب اُن بزرگ صاحب نے عجیب بات فرمائی کہ اس سے معلوم ہوا کہ تمھاری کل سلطنت کی قیمت صرف ایک گلاس پانی اور ایک کٹورا پیشاب کے برابر ہے، شکر کرو اُس اللہ کا، جو تمھیں روزانہ پچاسوں گلاس پانی مفت پلا رہا ہے اور غور کرو اس کی قدرت پر جس سے کتنا پیشاب بغیر کسی معاوضے کے بہ آسانی نکل جاتا ہے؟! اگر اللہ بھی اپنی نعمتیں عوضاً دینے لگے، تو انساں کا جینا مشکل ہو جائے۔

ہر شخص روزانہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو سوچا کرے اور اس کا شکر بجالائے ، اس سے ایک طرف اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

آئینہ چینی شکست!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو بڑے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کو کسی نے چین کا بنا ہوا ایک آئینہ دیا، حضرت رحمہ اللہ نے اس کو لے کر کہا: ”الحمد للہ“ پھر انھوں نے اپنے خادم کو دیا کہ اس کو رکھو، جب ضرورت ہوگی لے کر اس میں چہرہ دیکھوں گا، اتفاق سے وہ ان کے خادم کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا، تو اس نے خدمت میں حاضر ہو کر ڈرتے ڈرتے کہا: ”از قضا آئینہ چینی شکست“ (اللہ کی قضاو فیصلے سے

چینی کا آئینہ ٹوٹ گیا) اوراس کو یہ خیال تھا کہ اس پر مجھے ڈانٹ پڑے گی کہ تم نے اس کو کیوں توڑا؟ مگر حضرت رحمۃ اللہ نے اس کے جواب فرمایا: ''الحمد للہ کہ آلہٗ خود بینی شکست'' (اللہ کا شکر ہے کہ خود بینی کا آلہ ٹوٹ گیا) خادم نے کہا کہ حضرت! جب آئینہ آیا تھا تب بھی آپ نے ''الحمد للہ'' کہا اور اب یہ ٹوٹا تو بھی ''الحمد للہ'' کہا، فرمایا کہ ہاں! یہ اللہ ہی کا ہے، جب وہ دے تو بھی ''الحمد للہ'' اور اس کا شکر ہے اور اگر وہ لے لے تو بھی ''الحمد للہ''۔

اولیاء اللہ کی نظر اشیا پر نہیں ہوتی؛ بل کہ خالقِ اشیا پر ہوتی ہے، وہ ہر وقت اسی پر نظر جمائے ہوئے ہوتے ہیں۔

اللہ کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے

فرمایا: ایک صاحب میرے پاس آ کر کہنے لگے کہ حضرت! دعا کریں، میرے کچھ مسائل اٹکے ہوئے ہیں، میں یہ کرنا چاہتا ہوں؛ مگر یہ کام نہیں ہوتا اور وہ کام کرنا چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا، اس طرح میرے سب کام ادھورے اور ناقص رہ جاتے ہیں، میں بہت پریشان ہوں۔

میں نے ان سے کہا: آپ ان دو چار مسائل کو لے کر شکوہ کرنے لگے؛ مگر آپ کی نظر ان ہزاروں مسائل کی طرف نہیں گئی، جن کا خود آپ کو علم نہیں؛ مگر اللہ ان کو پورا کر رہا ہے، آپ کو یوں سوچنا چاہیے کہ میرے کتنے کام ایسے ہیں؟ جن کو میں سوچتا ہوں فوراً ہو جاتے ہیں، پھر میں نے کہا کہ آپ صبح اٹھے ہوں گے، تو آپ نے چاہا ہوگا کہ میں بستر سے اٹھوں اور فوراً اٹھ گئے اور چلنا چاہا، چلنے لگے، استنجا کرنا چاہا ہوگا، وہ بہ آسانی ہو گیا، ایسے ہزاروں مسائل ہیں، جو آپ سوچتے ہی فوراً ہو جاتے ہیں اور یہ سب بھی اللہ کی مدد سے ہوتے ہیں؛ مگر ان کی طرف آپ کی نظر نہیں جاتی اور

ان کی وجہ سے اللہ سے شکوہ پیدا نہیں ہوتا ہے، پھر میں نے کہا کہ یہ بھی سوچیے کہ اگر اللہ آپ کے پیروں کو اکڑوا دیتا، وہ چلنے سے عاجز ہو جاتے، تو آپ کیا کرتے؟ ہاتھوں کو بھی ایسا کر دیتا تو کیا کر لیتے؟ خدا کی قسم! آپ دن بھر کی نعمتوں کا اگر اندازہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، پوری زندگی کی نعمتوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ خود حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عام طور پر جن کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہوتا ہے، وہ صرف اس طرف نظر ڈالتے ہیں کہ ہمارا یہ اور وہ کام نہیں ہو رہا ہے، اگر وہ لوگ یہ سوچا کریں کہ ہمارے روزانہ کتنے کام بغیر سوچے اور بغیر کوشش و محنت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انجام پا رہے ہیں؟ تو ان کا سارا شکوہ ختم ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

لقمان حکیم رحمۃ اللہ کا شکر

لقمان حکیم رحمۃ اللہ کسی کے غلام تھے، ایک مرتبہ باغ میں ان کا آقا آیا اور ایک پھل کاٹ کر حضرت لقمان رحمۃ اللہ کو دیا، تو وہ مزہ لے کر کھانے لگے، جب ایک ٹکڑا اس نے خود کھایا، تو معلوم ہوا کہ بڑا کڑوا پھل ہے، اس نے تھوک دیا اور کہنے لگا کہ لقمان! تم کو یہ پھل کڑوا نہیں لگ رہا ہے؟ تو حضرت لقمان رحمۃ اللہ نے جواب دیا کہ آپ کے ہاتھ سے میں نے کتنی میٹھی میٹھی چیزیں کھائی ہیں؟ آج ایک مرتبہ آپ کڑوا پھل کھلا دیں، تو کیا میں شکوہ کروں؟

اللہ اکبر! کیسا عجیب جواب دیا، اگر ہم بھی اللہ کے بارے میں ایسا ہی خیال کریں، تو ہماری کیا حالت ہوگی؟ اللہ کو ناشکری پسند نہیں، اگر شکر کرو گے تو نعمت

میں اضافہ ہوگا﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ ﴾ اگراللہ مال دے دے تو بھی خوش رہو اور نہ دے تو بھی خوش رہو اور صحت دے تو بھی راضی رہو، بیماری دے تو بھی خوش رہو۔

نیکیوں کی توفیق سب سے بڑی نعمت ہے-ایک واقعہ

فرمایا: لوگ عموماً نعمت، صرف مال و دولت کو سمجھتے ہیں، حال آں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو طاعت وعبادت کی توفیق مل جائے، تو یہ بہت بڑی دولت ہے، اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے؟ مگر لوگ اس کو نعمت سمجھتے ہی نہیں، اس پر حضرت والا نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک بزرگ ایک بستی سے دوسری بستی کو جارہے تھے، جب دوسرے شہر کے قریب ہوئے تو دیکھا کہ شہر پناہ کے دروازے بند ہیں اور دن کا وقت ہے، ان کو بڑا تعجب ہوا کہ دن میں شہر کا دروازہ کیوں بند ہے؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس شہر کے بادشاہ کا ایک پالتو پرندہ ''باز'' اُڑ گیا ہے، جس کی تلاش جاری ہے اور دروازے بند اسی لیے ہیں؛ تا کہ ''باز'' شہر کے اندر ہی رہے اور دروازے سے کہیں باہر نہ چلا جائے۔ ان بزرگ نے سوچا کہ کتنا بڑا بے وقوف بادشاہ ہے کہ ''باز'' تو اُوپر جو کھلی فضا ہے، وہاں سے بھی جا سکتا ہے؟ اسے اتنی بھی عقل نہیں اور اس نے شہر پناہ کا دروازہ بند کروادیا ہے۔

پھر وہ بزرگ اللہ کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے حکومت وسلطنت اور مال ودولت اس بے وقوف بادشاہ کو دے دی ہے، جو عقل سے بالکل عاری ہے اور مجھ جیسے عاقل کو کچھ نہیں دیا!! تو اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا آپ اس پر راضی ہیں کہ اس کی بے وقوفی وحماقت کے ساتھ آپ کو یہ دولت وحشمت اور حکومت وسلطنت اور جاہ وجلال سب کچھ اس بادشاہ سے چھین کر آپ کو دے دی

جائے اور آپ کی عقل مندی اور تقوی شعاری، نیکیاں اور طاعتیں سب اُس کو دے دی جائیں؟ تو ان بزرگ کو فوراً احساس ہوا اور اللہ سے معافی مانگی اور کہنے لگے کہ یا اللہ! مجھے تقوے والی دولت زیادہ پسند ہے، اگرچہ غریبی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، اور یہ حکومت وسلطنت اس کی بے قوفی و بے ایمانی سمیت لینے سے تو ایمان وعمل کے ساتھ فقر وفاقہ ہی بہتر ہے۔

قلب اللہ کا مکان ہے

اپنے دل کو دنیا اور اس کی محبت اور تمام نفسانی خواہشات سے پاک وصاف رکھنا چاہیے؛ کیوں کہ یہ دل تو اللہ کا گھر ہے، اس کی پاکیزگی، دوسرے اعضا اور دوسری اشیا کے مقابلے میں بہت زیادہ ضروری ہے۔ آج لوگ ذرا سے کپڑے میلے ہو جائیں، تو نکال دیتے ہیں؛ مگر دلوں کا حال یہ ہے کہ اس میں نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے؛ مگر اس کے صاف کرنے کی کسی کو فکر نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ’’تم اپنے گھروں کے صحن کو پاک وصاف رکھو۔‘‘ (الجامع للترمذي:۲۷۳۲)

جب نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم گھروں کے صحن کو بھی پاک وصاف رکھنے کا حکم فرمارہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب گھر کے صحن کو پاک رکھنا ضروری ہے، تو گھر کے اندر کا حصہ پاک رکھنا بہ درجۂ اولی ضروری ہے، اسی طرح جب ظاہر کے صاف رکھنے کا حکم ہو، تو باطن کو پاک رکھنا کتنا ضروری ہوگا؟!

یہاں ایک بات سمجھ لیں، وہ یہ کہ قلب ایک ایسی چیز ہے، جو دکھائی نہیں دیتی؛ بل کہ وہ تو ایک روحانی چیز ہے؛ اسی لیے قرآن میں فرمایا: ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (قٓ:۳۷) جس

شخص کا دل ہے، اس کے لیے نصیحت کارگر ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ قلب تو کافر کے پاس بھی ہے، ملحد کے پاس بھی ہے، تو کیا قرآن سب کو کارگر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قلب سے روحانی قلب مراد ہے، وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں، جس میں کافر ومؤمن سب شریک ہیں اور یہی روحانی قلب رب کا مکان ہے، حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ کے لیے اہلِ زمین کے برتن ہیں اور تمھارے رب کے برتن، اس کے نیک بندوں کے قلوب ہیں اور اس کے نزدیک پسندیدہ قلوب وہ ہیں، جو نرمی اور رقت والے ہیں۔

(المقاصد الحسنة:۴۳۹)

بھائی! اب ذرا غور کرو کہ جب ایک معمولی انسان کسی کے گھر آجائے، تو گھر کو کتنا پاک وصاف کیا جاتا ہے؟! اس کو کتنا سجایا جاتا ہے؟ جب یہ دل خدا کا گھر ہے، تو کیا اس کو گندا و ناپاک رکھا جاسکتا ہے؟ کیا انسان کی قدر ہمارے نزدیک خدا سے بڑھی ہوئی ہے؟ کہ ہم اپنے گناہوں، خطاؤں کے گھر میں اس کو پانا چاہتے ہیں؛ اس لیے بھائی! اس دل کو سنوارو! سجاؤ! خوبصورت بناؤ! خدا کی محبت سے اپنے دل کو حسین وجمیل بناؤ! اس کے بعد دیکھنا کہ خدا کیسے دل میں آتا ہے!!

حضرت خواجہ مجذوب صاحب رَحِمَہُ اللہُ کا ایک شعر یاد آگیا:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی　　　اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اور اسی مضمون پر میرے بھی دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

نقشِ لیلیٰ ہو چکا ہے پاش پاش　　　عشقِ مولیٰ اب تو حاصل ہوگیا

ہوگئی ہے ہر تمنا دل سے دور　　　اب تو یہ دل تیرے قابل ہوگیا

اس میں اشارہ ہے کہ جب تک دل کو غیر اللہ اور دنیوی محبتوں سے خالی نہیں کیا

جائے گا اس وقت تک اللہ دل میں نہیں آسکتا؛ اس لیے دنیوی و فانی لیلیٰ کو مولیٰ کے لیے قربان کردو۔

جذبۂ شکر پیدا کرنے کا طریقہ-ایک واقعہ

فرمایا: آدمی ہمیشہ ہر دنیوی چیز میں اپنے سے نیچے کے طبقے والوں کو دیکھے، تو شکر کرے گا، اگر اپنے سے اونچے طبقے والوں کی طرف نظر کرے گا، تو ناشکری میں مبتلا ہوگا یعنی اگر کوئی متوسط درجے کا مال دار ہے تو وہ غریبوں کو دیکھے اور شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے اس سے اچھا رکھا ہے، اسی طرح کسی کو اللہ نے معمولی سا گھر دیا ہے، تو وہ جھونپڑی میں رہنے والے کی طرف نظر کرکے شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے مکان تو دیا ہے، اس کے برخلاف اگر متوسط درجے کا مال دار اپنے سے بڑے مال دار کی طرف نظر کرے گا، تو حرص میں یا حسد میں مبتلا ہوگا اور ناشکری کرے گا کہ اللہ نے اس کو اتنا مال دیا ہے اور مجھے نہیں دیا۔

اس کے بعد حضرت والا نے شیخ سعدی رحمۃ اللہ کا واقعہ سنایا کہ وہ ایک مرتبہ گھر سے نکلے تو پیر میں پہننے کے لیے جوتے نہیں تھے، دل ہی دل میں کہنے لگے کہ اللہ نے مجھے جوتے بھی نہیں دیے ہیں، پھر پیدل تھوڑی دور گئے، تو دیکھا کہ ایک فقیر بھیک مانگ رہا ہے، جس کے دونوں پیر رانوں تک کٹے ہوئے ہیں، یہ منظر دیکھ کر شیخ سعدی رحمۃ اللہ نادم ہوئے اور اللہ سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ مجھے صرف جوتے نہیں دیے، اس بے چارے کو تو پیر ہی نہیں دیے ہیں، اگر تو مجھے بھی اس جیسا بناتا تو میں کیا کرسکتا تھا؟

دل زنگ آلود ہوجاتا ہے

ایک مرتبہ حضرت والا کے پاس دفتر میں جو فون تھا، اس پر گرد و غبار پڑا ہوا تھا،

رومال سے ایک بار جھاڑا گیا، تو وہ صاف ہوگیا، یہ دیکھ کر حضرت اقدس نے فرمایا: دل کی مثال بھی ایسی ہی ہے کہ گناہوں کی وجہ سے اس پر گرد آتا رہتا ہے؛ اس لیے روزانہ ہم دل کو استغفار کی کثرت، ذکر و تسبیح وغیرہ سے جھاڑتے رہیں گے، تو وہ صاف شفاف آئینے کی طرح رہے گا، جس کی وجہ سے طاعت میں حلاوت آئے گی، نیکیوں میں جی لگے گا اور اگر یوں ہی بغیر صفائی کے چھوڑ دیں گے، تو اس دل پر گناہوں کی دھول جمتے جمتے، وہ دل زنگ آلود ہو جائے گا، جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ان کے دلوں پر زنگ آ گیا ہے) (المطففین: ۱۴)

پھر جس طرح برتنوں وغیرہ میں زنگ آ جائے، تو اس کی صفائی دشوار ہوتی ہے، اسی طرح دل کی صفائی بھی مشکل ہوگی؛ اس لیے اس کی صفائی بار بار کرتے رہنا چاہیے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ ، قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ! وَمَا جلاءُهَا ؟ قَالَ: كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَ تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ." (مشکوۃ المصابیح:۱۸۹)

(بلا شبہ ان دلوں پر زنگ آ جاتا ہے، جیسے لوہے پر زنگ آ جاتا ہے، جب اسے پانی لگ جاتا ہے، پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! اس زنگ کو صیقل کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موت کی یاد اور تلاوت قرآن کی کثرت۔)

جب موت کو یاد کرے گا، تو نرمی پیدا ہوگی، رونا آئے گا، جب روئے گا تو دل کی صفائی ہوگی؛ کیوں کہ آنسوں کا قطرہ جہنم کی آگ کو بجھا سکتا ہے تو دل کے زنگ کو بھی ضرور دور کر سکتا ہے۔

دلوں پر زنگ کیوں آتا ہے؟

مرشدی حضرت شاہ ابرارالحق صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا: دلوں پر زنگ آنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے کو جب پانی لگتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے؛ کیوں کہ پانی اور لوہے میں مناسبت نہیں ہے، دونوں میں جوڑ نہیں ہے، ناجنس کی صحبت کی وجہ سے اس کو زنگ لگتا ہے، اسی طرح سے جب دو بے جوڑ اور ناجنس چیزیں ملتی ہیں، تو فتور پیدا ہو جاتا ہے، فرمایا کہ اسی طرح جب دل ناجنس اور بے جوڑ چیز (یعنی گناہ) سے ملتا ہے، تو زنگ آجاتا ہے۔

بایزید بسطامی رَحِمَہُ اللہُ کے دودھ کا واقعہ

بایزید بسطامی رَحِمَہُ اللہُ بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے، ان کا انتقال ہوا، تو کسی نے خواب میں ان کو دیکھ کر پوچھا کہ حضرت! اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو جواب دیا کہ جب پیشی ہوئی تو اللہ نے پوچھا کہ بایزید! میرے لیے کیا لائے ہو؟ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: اے اللہ! کوئی عبادت اس لائق نہیں کہ تیری جناب میں پیش کرسکوں، سب میں عیب وقصور ہے؛ البتہ تیرے لیے توحید لایا ہوں؛ کیوں کہ میرا عقیدہ تو مضبوط تھا کہ تو ہی سب کچھ کرنے والا ہے، نفع کا مالک تو، نقصان کا مالک تو، مشکل کشا تو، حاجت روا تو؛ اس لیے میری جانب سے آپ کے لیے توحیدِ خالص کا تحفہ پیش ہے۔

فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ اچھا! توحید لائے ہو، وہ دودھ کی رات والا قصہ یاد نہیں؟ تو میں نے لاعلمی ظاہر کی، تو اللہ نے خود یاددہانی فرمائی اور کہا: ایک رات تم نے دودھ پیا تھا، پھر تمھارے پیٹ میں درد ہو گیا، تو تم نے کہا تھا کہ دودھ نے پیٹ میں درد پیدا کر دیا، بتاؤ! درد میں پیدا کرتا ہوں، یا دودھ کرتا ہے؟ کیا یہی تمھاری

توحید ہے؟ جس کو تم میرے دربار میں پیش کرنا چاہتے ہو؟ جاؤ!اس میں شرک کی آمیزش ہے، حضرت بایزید رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ! میرے پاس تو کچھ نہیں ہے، نہ کوئی عمل و نیکی، نہ ایمان و توحید، جو تیرے شایانِ شان ہو؛ اس لیے محض تیرے فضل سے معاف فرمادے۔

کسی شاعر نے قیامت کے میدان کا نقشہ کھینچا ہے اور اپنے ایک شعر میں یہی مضمون بڑے عجیب انداز سے ادا کیا ہے:

نیکیاں جن کو میں سمجھا، وہ معاصی نکلے   کفر ہی کفر تھا، ایمان بڑی مشکل ہے

دین میں ایسی استقامت آجائے۔ایک واقعہ

دین پر استقامت بڑی چیز ہے اور یہی آج کل مفقود ہے، نوجوان لوگ دین پر آنا چاہتے ہیں اور آتے بھی ہیں؛ مگر یہی استقامت نہ ہونے کی وجہ سے، نماز شروع کرتے ہیں پھر چھوڑ دیتے ہیں، علمِ دین حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر استقامت میں کمی سے وہ بجھ جاتا ہے۔

میں ایک واقعہ سناتا ہوں، جس سے استقامت کا جذبہ پیدا ہوگا، ہمارے حضرت مسیح الامت رحمۃ اللہ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کہیں جارہے تھے، راستے میں دیکھا کہ ایک چور کو سولی پر چڑھایا جا رہا ہے، حضرت جنید رحمۃ اللہ نے لوگوں سے پوچھا کہ کس جرم کی پاداش میں اس کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے؟ بتایا گیا کہ یہ منع کرنے کے باوجود چوری کرنے سے باز نہیں آتا، برابر چوری کرتا رہتا تھا، اس نے ایک دفعہ چوری کی تو اس کا ایک ہاتھ کاٹا گیا ،دوسری دفعہ چوری کی تو دوسرا ہاتھ کاٹا گیا؛ مگر یہ پھر بھی باز نہیں آیا؛ اس لیے یہ سزا دی جا رہی ہے۔ یہ سن کر حضرت جنید رحمۃ اللہ نے فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے

پیروں کو بوسہ دوں، پوچھا گیا کہ حضرت! آپ اس چور کے پیروں کو بوسہ دیں گے ؟!! آخر کیوں؟! تو فرمایا: میں اس چور کو نہیں ؛ بل کہ اس کے اندر کی استقامت کے پیروں کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اگر ایسی استقامت ہم دینی کاموں میں پیدا کرلیں تو معلوم نہیں کتنی ترقی کریں گے؟

انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں

فرمایا: انسان کو تین چیزیں ہلاک کرتی ہیں اور تینوں کا نام ''منی'' ہے:

پہلی ''منی'': جس کو اردو میں ''منی'' کہتے ہیں یعنی نطفۂ ناپاک۔ یہ انسان کو ہلاک کرنے والا ہے؛ کیوں کہ دنیا میں جتنے بھی زنا کے واقعات، فحش وعریانی، بے حیائی، جنسی بے راہ روی کے واقعات رونما ہو رہے ہیں، یہ اسی نطفۂ ناپاک کے غیر محل میں استعمال ہونے کی وجہ سے ہو رہے ہیں؛ اسی لئے ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے دے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں: ایک وہ جو دو جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور ایک وہ جو دو رانوں کے درمیان میں ہے (یعنی شرمگاہ)۔

(الصحیح للبخاري:۵۹۹۴، الجامع للترمذي:۲۳۳۲)

دوسری ''منی'': دوسری منی وہ ہے جو انگریزی کا لفظ ہے (MONEY)، انگریزی میں ''منی'' (MONEY) کہتے ہیں روپیے اور مال کو، یہ روپیہ پیسہ و مال تو سب سے بڑا فتنہ ہے، سب سے بڑا مہلک ہتھیار ہے، ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ لِکُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ''. (الجامع للترمذي:۲۲۵۸)

(بلاشبہ ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔)

چناں چہ آج دنیا کے سارے جھگڑے اس مال ہی کی وجہ سے رونما ہو رہے ہیں، کوئی دھوکہ دے رہا ہے، کوئی چوری کر رہا ہے، کوئی اس مال کی خاطر سودی کاروبار میں ملوث ہو کر اللہ کی نافرمانی کر رہا ہے، مال کی محبت دل میں ایسی رچ بس گئی ہے کہ حرام و حلال کی تمیز بھی نہیں ہے، یہ سخت فتنہ اور ہلاک کرنے والی چیز ہے۔

مال و دولت کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کہ جب تک وہ کشتی کے نیچے رہے تو ٹھیک ہے اور نفع بخش بھی ہے؛ لیکن جب پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے گا، تو ساروں کو ہلاک کر دے گا، اسی طرح جب تک مال باہر باہر ہو تو ٹھیک ہے؛ مگر جب اس کی محبت دل میں داخل ہو گی، تو انسان کو اسی طرح ہلاک کر دے گا، جیسے کشتی میں پانی داخل ہو کر کشتی والوں کو ہلاک کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں آپ نے صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا: " تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ" (دینار اور درہم کا بندہ ہلاک ہو گیا۔)

(الصحيح للبخاري:۲۶۷۳، السنن لابن ماجة:۴۱۲۶)

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بحرین سے خراج کا مال آیا، چوں کہ فقر و فاقے کا دور تھا، بہت سارے صحابہ مال لینے جمع ہو گئے، نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شاید تم لوگ مال لینے جمع ہوئے ہو، پھر فرمایا: خدا کی قسم مجھے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم فقر و فاقے میں مبتلا ہو جاؤ گے، مجھے تو اس کا ڈر ہے کہ تم پر دنیا وسیع کر دی جائے اور تم اس میں جھگڑنے لگو، جس طرح پچھلے لوگوں نے اس میں جھگڑا کیا تھا۔

(الصحيح للبخاري:۲۹۲۴، الصحيح للمسلم:۵۲۶۱)

معلوم ہوا کہ یہ منی (MONEY) بھی بڑی خطرناک شئے ہے اور ہلاک کرنے

والی ہے۔

تیسری ''منی'': فارسی کا لفظ ہے، فارسی میں ''منی'' کہتے ہیں، میں پن کو یعنی انانیت کو، تکبر کو۔ تکبر کے معنے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا، یہ بڑی خطرناک روحانی بیماری ہے۔ بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ کفر، تکبر ہی سے پیدا ہوتا ہے؛ کیوں کہ شیطان نے اسی تکبر کی وجہ سے اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا تھا؛ اس لیے تکبر انسان کو اسی طرح ہلاک کر دیتا ہے، جیسے شیطان کو تکبر نے ہلاک کر دیا؛ کیوں کہ شیطان نے تکبر ہی کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تھا اور ذلیل وخوار کر کے بارگاہ الٰہی سے نکال دیا گیا تھا۔

معلوم ہوا کہ کفر کی جڑ اصل میں تکبر ہے، اب اندازہ کرنا چاہیے کہ کفر جب سب سے بری چیز ہے، تو جس سے کفر نکل کر آرہا ہے، جو مصدرِ کفر ہے، وہ کتنا برا ہوگا؟

اسی لیے اسلام میں تکبر کی سخت مذمت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: " لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ مِنْ كِبْرٍ"

(الصحيح للمسلم:١٣٢، الجامع للترمذي:١٩٢١)

(جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جاسکتا۔)

اور قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴾ (الإسراء:٣٧)

(تم زمین پر اتراتے ہوئے نہ چلو! کیوں کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہو)

اوراس کے بالمقابل اللہ والوں کی صفات میں ہے:﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ (الفرقان:٦٣)

(اوررحمٰن کے بندے وہ ہیں، جوزمین میں تواضع کے ساتھ چلتے ہیں۔)

حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری رَحِمَہُ اللّٰہُ جوحضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے جلیل القدرخلیفہ تھے،انھوں نے ان دوآیات میں ایک نکتہ بیان کیا ہے،فرمایا کہ پہلی آیت میں تکبر سے چلنے سے منع کیا گیا ہےاور دوسری آیت میں اللہ والوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عاجزانہ چال چلتے ہیں،اس میں ایک نکتہ ہے،وہ یہ کہ پہلی آیت میں ﴿فِي الْأَرْضِ﴾ فرمایا ہے،جب کہ دوسری آیت میں ﴿عَلَى الْأَرْضِ﴾ کہا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت مقامِ مذمت میں ہے؛اس لیے" في" لائے ہیں کہ تم زمین میں پیر مار مار کر نہ چلو کہ زمین ہی میں گھس جاؤ؛ کیوں کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو،نہ اونچائی میں پہاڑ تک پہنچ سکتے ہواور دوسری آیت مقام مدح میں ہے؛اس لیے وہاں﴿عَلَى الْأَرْضِ﴾ فرمایا ہے یعنی اللہ والے زمین پر عاجزانہ چال چلتے ہیں،اوپراوپر چلتے ہیں،زمین پر پیر مار مار کرنہیں چلتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ عارفانہ تفسیر ہے،مفسرین عالمانہ تفسیر کرتے ہیں اوراللہ والے عارفانہ تفسیر کرتے ہیں،تو معلوم ہوا رفتار میں تکبر نہ ہونا چاہیے، اسی طرح کردار بھی تکبرانہ نہ ہونا چاہیے۔ایک بزرگ نے فرمایا:انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ماضی میں نطفۂ ناپاک تھا،موجودہ حالت یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے پیٹ میں غلاظت لیے ہوئے پھرتا ہےاورایک دن آئے گا کہ قبر میں جا کر جیفۂ ناپاک (مردار) ہوجائے گا ،تعجب ہے کہ پھر بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے،ڈینگیں مارتا ہے!!اللہ تکبر سے ہماری حفاظت فرمائے۔

کبھی کتے سے بھی سبق مل جاتا ہے

امام شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ ایک راستے سے گزر رہے تھے، اُسی راستے میں دوسری طرف سے ایک کتا آرہا تھا اور راستہ اتنا تنگ تھا کہ کوئی ایک ہی اس پر سے گزر سکتا تھا، جب کتا قریب آیا، تو شاہ صاحب رحمہ اللہ نے کہا: ارے کتے! تو نیچے اتر جا، اس لیے کہ میں نیچے اتروں گا، تو میرے کپڑے گندے ہوجائیں گے اور مجھے نماز پڑھنا ہے اور تجھے کیا؟ تو تو گندگی ہی میں رہتا ہے، گندا ہوگا، تو پھر صاف بھی ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے کتے کو بولنے کی طاقت دے دی، کتا کہنے لگا، شاہ صاحب! آپ کی یہ بات تو صحیح ہے کہ اگر میں گندے نالے میں اتروں گا تو ناپاک ہوجاؤں گا، پھر پانی میں ایک ڈبکی لگاؤں گا، تو صاف ہوجاؤں گا؛ مگر آپ کے دل میں میری جو حقارت اور اپنی بڑائی آئے گی، اس سے آپ کے دل میں جو نجاست پیدا ہوگی، وہ سات سمندروں کے پانی سے بھی ختم نہیں ہوسکتی۔

اللہ اکبر! یہ سن کر شاہ صاحب رحمہ اللہ کتے سے معافی مانگنے لگے اور اللہ کی جناب میں توبہ کی، آج ہم لوگ کتے تو کتے، انسانوں؛ بل کہ اپنے سے بڑے وافضل لوگوں کی بھی تحقیر کرتے ہیں اور اپنے کو سب سے بڑا سمجھتے ہیں، غور کرو کہ ہمارے دلوں کی گندگی کا کیا حال ہوگا۔

اساتذہ کی بے ادبی کا عبرت ناک انجام

ایک واقعہ سناتا ہوں، جو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جو میرے طالب علمی کے دور میں پیش آیا ہے، ایک ہمارا ساتھی تھا اور بہت ذہین تھا، ایک مرتبہ سنتا تو پورا سبق یاد ہوجاتا تھا، بڑا ہی ذہین، بڑا چالاک اور صلاحیت واستعداد والا تھا،

وہ طلبہ کو تکرار کرایا کرتا تھا؛ مگر اس میں ناز و تکبر تھا، وہ اپنی تکرار میں یہ کہا کرتا تھا کہ میں اُستاذ سے بھی اچھا پڑھا سکتا ہوں اور واقعی وہ بہت اچھے طریقے سے تکرار کراتا تھا اور سارے طلبہ اس کو مانتے تھے، جب سہ ماہی امتحان ہوا تو مدرسے کے تمام طلبہ میں اول نمبر پر کامیاب ہوا اور امتیازی نمبر حاصل کیے، مگر صرف تین ماہ بعد جب ششماہی امتحان آیا تو وہ بالکل زیرو (Zero) نمبر آیا اور ناکام ہو گیا، اب یہ سوچنا ہے کہ سہ ماہی اور ششماہی میں کتنے مہینے ہوتے؟ بہ مشکل تین ماہ، اس کے باوجود اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونے والا زیرو نمبر سے فیل کیوں ہو گیا؟

اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے اپنے سے بڑوں کی، اپنے اساتذہ کی تحقیر کی؛ ان کو اپنے سے بڑا سمجھنے کے بہ جائے، اپنے سے چھوٹا سمجھا اور ان کی بے ادبی کی اور یہ سب تکبر کی وجہ سے ہوا، اب معلوم نہیں وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے، کیسا ہے؟!!

طلبہ کو اس قصے سے عبرت لینا چاہیے اور اپنے اساتذہ اور بڑوں کا ادب کرتے رہنا چاہیے، ان کی تحقیر و توہین ہرگز نہ کرنا چاہیے، اسی سے علم آتا ہے؛ ورنہ اولاً تو علم نہیں آتا اور اگر آ گیا تو وہ علم نفع نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اساتذہ اور مشائخ کے ادب کی توفیق دے اور بے ادبی سے حفاظت فرمائے۔ (آمین)

کسی کو حقیر نہ سمجھو

اساتذہ کی ہی کی نہیں اسلام میں تو کسی کی بھی توہین و تحقیر جائز نہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے:

﴿یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَانِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسٰی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ﴾ (الحجرات: 11)

اس میں یہ بتلایا گیا کہ کوئی مرد کسی مرد کو، کوئی عورت کسی عورت کو حقیر نہ سمجھے،

ہوسکتا ہے کہ جسے حقیر سمجھا جائے وہ حقیر سمجھنے والے سے اچھا ہو؛ اس لیے کہ کسی کے دل کے حالات، سوائے اللہ کے کسی کو نہیں معلوم، بسا اوقات کسی کو حقیر سمجھتے ہیں؛ مگر اس کا تعلق اللہ سے بہت گہرا ہوتا ہے، جو بھی سالک کسی کو حقیر سمجھے گا، وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا؛ حتی کہ گنہ گار کو بھی حقیر نہ سمجھو، حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ گناہ کو تو حقیر سمجھو؛ مگر گنہ گار کو حقیر نہ سمجھو، پھر حضرت والا نے مثال دی، جیسے بچے کو اگر پاخانہ لگ جائے، تو ماں اس بچے کو گندا نہیں سمجھتی؛ بل کہ اس کی نجاست کو برا سمجھتی ہے۔کیا عمدہ مثال دی حضرت نے!! پھر فرمایا کہ ماں اس نجاست کو پیار و محبت سے صاف کرتی ہے، اسی طرح اگر کسی انسان کو گناہ میں مبتلا دیکھو تو پیار و محبت سے سمجھاؤ، حقارت سے نہیں۔

حقیر سمجھنے کا انجام-ایک عبرت ناک حکایت

ابوعبداللہ اندلسی رحمہ اللہ حضرت شبلی رحمہ اللہ کے ساتھیوں میں ہیں، حافظِ حدیث تھے، کئی ہزار احادیث یاد تھیں، وہ ایک مرتبہ کہیں جارہے تھے، راستے میں کچھ لوگ بتوں کی پوجا میں مصروف تھے، ان کو دیکھ کر دل میں ان کی حقارت آ گئی اور دل دل میں کہنے لگے، یہ تو جانور سے بدتر ہیں، بس اسی پر اللہ کی پکڑ شروع ہو گئی آگے بڑھے تو ایک لڑکی پر نظر پڑ گئی، اس پر دل فریفتہ ہو گیا، اس سے جا کر کہا کہ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، اس نے کہا کہ میرے والد سے بات کرو، انھوں نے اس لڑکی کے والد سے بات کی، تو اس نے کہا: میں دو شرطوں پر میری لڑکی سے تمھاری شادی کروں گا: ایک شرط یہ کہ تم عیسائی بن جاؤ، دوسری شرط یہ کہ میرے خنزیر ہیں، ان کو چرانا ہوگا، چوں کہ ان کا دل اس لڑکی کی طرف بہت مائل ہو چکا تھا؛ اس لیے انھوں نے ان دو شرطوں کو قبول کرلیا اور عیسائی بن گئے، بہت دنوں بعد ان

کے پاس شبلی رحمۃ اللہ آئے، دیکھا کہ عیسائی بن گئے ہیں اور خنزیر چرا رہے ہیں، شبلی رحمۃ اللہ نے کہا: تم کو کوئی آیت یاد بھی ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! صرف ایک آیت یاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيْلِ﴾ (جو اپنے سچے دین کو بدل دے وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا) پھر شبلی رحمۃ اللہ نے دریافت کیا کہ احادیث میں سے کچھ یاد ہیں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں صرف ایک حدیث یاد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ'' (جو مرتد ہو جائے اسے قتل کر دو)

(الصحیح للبخاري:٢٧٩٤، الجامع للترمذي:١٣٧٨)

پھر ان پر اللہ کا فضل ہوا اور شبلی رحمۃ اللہ نے سمجھایا تو دوبارہ اسلام لائے، اس واقعے میں آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کو یہ سزا الخلوق کی حقارت کرنے پر ملی، حالاں کہ انھوں نے کافروں کو حقیر سمجھا تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافروں کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے؛ بل کہ ان کے گناہ کو حقیر سمجھنا چاہیے۔

گناہ کر کے حقیر سمجھنا بہتر ہے

''مکتوبات امام ربانی'' میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! میرے اندر دو حالتیں ہیں: ایک یہ کہ عبادت کرتا ہوں تو تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہوں، دوسری یہ کہ اگر گناہ ہو جائے تو اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہوں، ان دو حالتوں میں سے بہتر کونسی حالت ہے؟

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ نے ان کے جواب میں لکھا: تمھاری دوسری حالت کہ گناہ کر کے اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ ہزاروں درجہ بہتر ہے پہلی حالت سے، جس میں عبادت کر کے فخر میں مبتلا ہو جائے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائیں۔ آمین۔

واعظین اپنے کو بڑا نہ سمجھیں

فرمایا: آج لوگ وعظ ونصیحت کر کے اپنے آپ کو بڑا اور مخلوق کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ بڑی غلط بات ہے۔ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ جو اپنے زمانے کے "حکیم الامت" مانے جاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی کو وعظ کہتا ہوں یا نصیحت کرتا ہوں، تو اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ شہزادے کو یہ بات سنادو۔

بہت بڑی بات فرمائی حضرت رَحِمَہُ اللّٰہُ نے، جو انسان سامعین کو شہزادہ تصور کرے وہ ان کو حقیر کیسے سمجھ سکتا ہے؟ اس لیے کہ بادشاہ کسی خادم کے ذریعے شہزادے کو کوئی بات کہلوائے تو خادم شہزادے سے بڑا نہیں ہو جاتا؛ مگر افسوس ہے کہ واعظین آج لوگوں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے لیے نامناسب القاب استعمال کرتے ہیں؛ اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک بزرگ کا قصہ

ایک بزرگ کسی بادشاہ کو زور زور سے ڈانٹنے لگے، تو اس نے کہا: حضرت! آپ موسی عَلَیْہِ السَّلَامُ سے بڑے نہیں ہیں اور میں فرعون سے گھٹیا نہیں ہوں، جب اللہ نے موسی عَلَیْہِ السَّلَامُ جیسے نبی کو فرعون جیسے کافر کے پاس بھیجا تھا، تو اس سے بھی نرمی سے بات کرنے کی ہدایت دی تھی: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى﴾ (طٰہٰ: ۴۴) آپ مجھے اتنی شدت وسختی سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا میں فرعون سے بھی گیا گزرا ہوں اور آپ موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ سے بھی فائق ہیں؟!!

جو دل اللہ سے غافل ہو وہ مردہ ہے بایزید بسطامی رَحْمَۃُ اللّٰہ کا واقعہ

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت بایزید بسطامی رَحْمَۃُ اللّٰہ سے ملاقات کے شوق میں اپنے وطن سے نکلا، سفر کرتا ہوا ایک راستے میں ایک جگہ درخت کے سایے میں آرام کرنے لیٹا، تو دیکھا کہ دو چڑیاں آپس میں بات کر رہی ہیں اور یہ شخص چڑیوں کی بولی جانتا تھا، (درمیان میں حضرت نے فرمایا: اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو چرند پرند کی بولی سکھا دیتے ہیں، یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے اور قرآن سے بھی ثابت ہے حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں ہے: ﴿وَعُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ﴾ حضرت سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا کہ ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔)

الغرض ان میں سے ایک چڑیا، دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی کہ معلوم ہے یہ آدمی جو درخت کہ نیچے ہے، کہاں جارہا ہے؟ دوسری چڑیا نے کہا: ہاں یہ بایزید بسطامی رَحْمَۃُ اللّٰہ کے پاس جارہا ہے، تو اس چڑیا نے کہا: ان کا تو انتقال ہو گیا، یہ شخص یہ بات سن کر پریشان ہوا اور واپسی کا ارادہ کرلیا، پھر سوچا کہ جب نکلا ہی ہوں تو جا کر زیارت کرلوں، پھر آگے سفر جاری رکھا اور بایزید بسطامی رَحْمَۃُ اللّٰہ کے پاس پہنچا، تو دیکھا کہ وہ تو باحیات ہیں، ملاقات کی، گفت وشنید کے بعد رخصتی کے وقت کہنے لگا کہ حضرت! ایک بات پوچھنا ہے! پھر چڑیا والا سارا قصہ سنایا، بایزید بسطامی رَحْمَۃُ اللّٰہ چونکے اور دریافت کیا کہ یہ کس دن اور کس وقت کا واقعہ ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں دن اور فلاں وقت کا واقعہ ہے، حضرت بایزید رَحْمَۃُ اللّٰہ کہنے لگے کہ ہاں بھائی! چڑیا سچ کہہ رہی تھی، اس وقت کچھ دیر کے لیے میرا دل اللہ سے غافل ہوگیا تھا، اللہ سے دل کا غافل ہونا، دل کا مردہ ہونا ہے۔

اللہ اکبر! ہمارا حال کیا ہے، ان کا دل تو کچھ دیر کے لیے مردہ ہوا تھا، ہمارا دل

ہمیشہ مردہ رہتا ہے، ہم اللہ کا ذکر ہی نہیں کرتے، عجیب واقعہ ہے، اس واقعے سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے اور ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنا اور اس کا دھیان رکھنا چاہیے۔

جانور سے بھی اپنے کو افضل نہ سمجھے

فرمایا: میں حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کی مجلس میں شریک تھا، حضرت نے فرمایا: بچو! تم سب میرے سے افضل ہو، میں تم میں سب سے زیادہ حقیر ہوں، پھر فرمایا: میں تو خنزیر سے بھی حقیر ہوں۔

اللہ اکبر! یہ اللہ والے سب کچھ کرنے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے، ہم کچھ کیے بغیر ہی اپنے آپ کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو خنزیر سے بھی افضل سمجھنے کی اجازت نہیں۔

ایک بزرگ کے سامنے کسی نے خنزیر کو برا جانور کہا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، تو انھوں نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو، برے تو ہم ہیں؛ کیوں کہ وہ تو اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہے، جس کے لیے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے؛ مگر ہم اپنی ڈیوٹی انجام نہیں دے رہے ہیں جس کے لیے اللہ نے ہمیں پیدا کیا، اب بتاؤ! ہم بہتر ہیں یا خنزیر بہتر ہے؟

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی تواضع

ایک مرتبہ کوئی شخص امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے مسئلہ پوچھنے گیا، امام صاحب اُوپر کی منزل میں اپنے حجرے میں تھے، سائل نے آواز دے کر امام صاحب رحمہ اللہ کو بلایا، امام صاحب رحمہ اللہ جب نیچے اتر کر آئے تو کہنے لگا، حضرت! معاف کرنا، ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا؛ مگر میں بھول گیا کہ کیا مسئلہ تھا، امام صاحب رحمہ اللہ کہنے لگے: کوئی بات نہیں، جب یاد آئے تو آ کر پوچھ لینا، یہ کہہ کر

امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ اپنے کمرے میں اوپر تشریف لے گئے، جیسے ہی امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ اُوپر چڑھے، تو اس شخص نے آواز دی کہ حضرت! یاد آ گیا ذرا نیچے آیے، امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ جب نیچے آئے تو کہنے لگا کہ عجیب بات ہے کہ میں پھر بھول گیا، امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ پھر یہ کہہ کر تشریف لے گئے کہ یاد آئے تو معلوم کر لینا؛ مگر اس نے اسی طرح سات مرتبہ امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ کو اُوپر چڑھایا اور اتارا، یہ بلاتا اور کہتا کہ حضرت بھول گیا، آخری مرتبہ جب آپ آئے تو کہنے لگا کہ ہاں اب یاد آ گیا، یہ مسئلہ پوچھنا ہے کہ پاخانہ میٹھا ہوتا ہے یا پھیکا؟

غور کا موقعہ ہے کہ ایک تو اس نے سات دفعہ ان کو چڑھنے اور اُترنے پر مجبور کیا، پھر جو مسئلہ پوچھا تو ایسا بے ہودہ مسئلہ پوچھا؛ مگر امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللہُ کی غایت تواضع دیکھیے کہ باوجود اس کے بے ڈھنگے سوال پر بالکل غصہ نہیں ہوئے اور جواب بھی دیا اور فرمایا کہ پاخانہ جب تک تازہ ہوتا ہے، میٹھا ہوتا ہے اور جب سوکھ جائے تو پھیکا ہو جاتا ہے، اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ نے جو کہا ہے اس کی کیا دلیل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب رَحِمَہُ اللہُ کو حیرت انگیز قسم کی ذہانت دی تھی، آپ نے فرمایا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب تک پاخانہ تازہ رہتا ہے، اُس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور مکھیاں میٹھی چیزوں پر ہی بیٹھتی ہیں اور جب وہ سوکھ جاتا ہے تو اس پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھیکا ہو جاتا ہے۔

بوعلی سینا اخلاق ندارد

بوعلی سینا جو بہت بڑا حکیم گزرا ہے، اس کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، اُنھوں نے ایک دفعہ بوعلی سینا کے بارے میں یہ کہہ دیا: ”بوعلی سینا اخلاق ندارد“ (بوعلی سینا اخلاق نہیں رکھتا) یہ جملہ جب بوعلی سینا کو معلوم ہوا تو اُس نے اخلاقیات پر

ایک بہترین کتاب تصنیف کردی اور اس میں اخلاق کی تمام تفصیلات جمع کر دیا، اخلاق کے اصول وفروع، اخلاق کی اقسام وانواع، اخلاق کے آثار ولوازمات وغیرہ سب کچھ لکھ دیا اور ایک نسخہ اُن بزرگ صاحب کے پاس بھی بھیجا، جنھوں نے یہ کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق ندارد، تو کسی نے ان بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے کہا تھا کہ بوعلی سینا اخلاق ندارد، اُس نے تو اخلاق پر اتنی زبردست کتاب لکھ کر بتا دیا ہے کہ وہ اخلاق جانتا ہے، حضرت نے کہا کہ میں نے کب یہ کہا تھا کہ ''بوعلی سینا اخلاق نداند'' کہ بوعلی سینا اخلاق جانتا نہیں، میں نے تو یہ کہا تھا کہ ''اخلاق ندارد'' یعنی وہ اخلاق رکھتا نہیں، جاننا الگ بات ہے، رکھنا الگ بات ہے، کتاب لکھ دینا الگ بات ہے اور اُسے عملی جامہ پہنانا الگ بات ہے۔

کرتے رہے پھر بھی ڈرتے رہے

''صید الخاطر'' میں ابن الجوزی رَحِمَہُ اللہُ نے لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بیان فرما رہے تھے اور سامعین میں دس ہزار کا مجمع تھا اور ان کا وعظ سن کر پورے کا پورے مجمع رو رہا تھا، سوچو کہ کیا عالی شان خطاب ہوگا؟! کیا پُر تاثیر بیان ہوگا؟! ابن الجوزی رَحِمَہُ اللہُ کہتے ہیں کہ اسی وقت میں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ اے اللہ! میں گنہ گار ہوں، جنت تو مجھے نہیں مل سکتی، میرے اعمال اس لائق نہیں اور مجھے جہنم میں ہی جانا ہے؛ اس لیے صرف ایک درخواست یہ کرتا ہوں کہ مجھے ان دس ہزار کے سامنے عذاب نہ دینا، ان سے اوجھل رکھ کر جہنم میں ڈالنا۔

اللہ اکبر! کیا عاجزی ہے؟! کیا تواضع ہے؟! میں نے ایک سفر کے دوران ابن الجوزی رَحِمَہُ اللہُ کی یہ بات پڑھی اور یہ واقعہ پڑھ کر میرا سر کچھ دیر کے لیے چکرانے لگا، واقعی یہ حضرات اپنے غایت تواضع وانتہائی عاجزی سے ہی اس قدر اونچے مراتب

پر فائز ہوئے ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس طریق کا حاصل یہی ہے کہ نیکی کرتا رہے اور پھر بھی ڈرتا رہے، گناہ کر کے ڈرنا کمال نہیں، نیکیاں کر کے ڈرنا کمال ہے۔

بچوں کو نیک بنانے ماں باپ کا نیک ہونا ضروری ہے

ایک میاں بیوی نے عہد کیا کہ ہم صحیح اور نیک زندگی گزاریں گے اور کوئی کام خلافِ شرع نہیں کریں گے؛ تاکہ ہمارے بچے پر اچھے اثرات مرتب ہوں، چناں چہ ان دونوں نے صحیح طریقے پر اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا اور احتیاط کی زندگی گزارتے رہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے بچے نے اسکول میں دوسرے بچے کا کچھ سامان چوری کرلیا، تو استاذ نے ماں باپ کو اطلاع دی، ماں باپ گئے اور بچے کو تنبیہ کی، پھر گھر آکر غور کرنے لگے کہ ہم نے عہد کیا تھا، نیک زندگی گزاریں گے، پھر بچے میں یہ چوری کا اثر کیسے ہوگیا؟ تو ماں نے کہا کہ اس میں غلطی میری ہے؛ کیوں کہ ہمارے پڑوس کے گھر میں ایک بیر کا درخت ہے، جس کی ایک شاخ ہمارے گھر میں آئی تھی اور اس بچے کا جب حمل مجھے تھا، تو میں نے اس میں سے بغیر اجازت کے کچھ بیر کھا لیے تھے؛ اسی چوری کا اثر بچے پر ہوا ہے۔

سُوْرَةُ الْفَاتِحَة درخواست ہے

چوں کہ انسان اللہ کے شایانِ شان درخواست پیش نہیں کرسکتا؛ اس لیے ﴿سُوْرَةُ الْفَاتِحَة﴾ میں اللہ تعالیٰ نے درخواست پیش کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی بھی یونیورسٹی میں، کسی بڑے ادارے میں، جامعہ و مدرسے میں داخلہ فارم میں پہلے ہی سے درخواست کا مضمون لکھا ہوا ہوتا ہے، طالبِ علم کو صرف دستخط کرنا ہوتا ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، مجھے منظور ہے، یہ

اسی لیے ہے کہ آنے والا صحیح درخواست پیش نہیں کرسکتا، کچھ نہ کچھ گڑ بڑ کر دیتا ہے، اصول وقواعد کو نہیں جانتا؛ اس لیے پہلے سے ہی درخواست کا مضمون لکھ کر رکھ دیا جاتا ہے، اسی طرح ﴿سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃ﴾ بھی درخواست ہے ،جس کو اللہ تعالیٰ نے ہماری خاطر خود ہی بنا کر ہمیں دے دیا؛ ورنہ اللہ کے شایانِ شان کون مضمون بنا سکتا تھا؟ پھر جب بندے نے درخواست پیش کی کہ اے اللہ! سیدھا راستہ بتا! تو اللہ نے اس کے جواب میں تیس پارے نازل کیے کہ یہ سارے احکامات ہیں، جن پر چلنے سے سیدھا راستہ ملے گا۔

انسان کی چار حالتیں

حضراتِ صوفیا فرماتے ہیں کہ انسان پر چار حالات آتے ہیں : ایک حالتِ نعمت، دوسری حالتِ مصیبت، تیسری حالتِ طاعت اور چوتھی حالتِ معصیت اور ہر وقت ہر انسان ان چار حالتوں میں سے دو حالات میں ضرور مبتلا رہتا ہے، اس لیے کہ انسان پر نعمت یا مصیبت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اسی طرح معصیت یا طاعت میں سے کوئی ایک حالت ضرور ہوگی، اس طرح ہر انسان پر ہر وقت دو حالتیں رہیں گی، پھر ان چاروں حالات کے چار حق ہیں: نعمت کا حق شکر ہے، مصیبت کا حق صبر ہے اور معصیت ہو تو استغفار یعنی توبہ اور طاعت ہو تو استبشار یعنی خوش ہونا اور حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے ،اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی دعا میں یہ بھی کہا کرتے تھے: " اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِيْنَ إِذَا أَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَإِذَا أَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا" (اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں سے بنا دے جو نیکیاں کرتے ہیں، تو خوش ہوتے ہیں اور ان سے برائی ہو جاتی ہے تو استغفار کرتے ہیں) (السنن لابن ماجة:۳۸۱۰،مسند أحمد:۱۲۲۲۲)

شکر گزار فقیر افضل ہے

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رَحِمَہُ اللہ سے پوچھا گیا کہ حضرت مال دار شکر گزار افضل ہے یا فقیر صابر افضل ہے؟ فرمایا: ان میں سے کوئی بھی افضل نہیں؛ بل کہ شکر گزار فقیر افضل ہے کہ مصیبت آئی تب بھی شکر کر رہا ہے، میں اس کی مثال دیتا ہوں، جیسے کوئی بیمار ہوا، ڈاکٹر نے کہا آپریشن کرنا ہوگا اور پیسے بھی دینے پڑیں گے، مریض نے ڈاکٹر سے آپریشن بھی کرایا اور پھر باادب روپیے بھی دیے اور اس پر ڈاکٹر کا شکریہ بھی ادا کیا، یہاں کوئی مریض یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرا جو آپریشن کیا، اس پر میں آپ کا کوئی شکوہ نہیں کرتا؛ بل کہ اس پر میں صبر کرتا ہوں؛ بل کہ یہ کہے گا کہ آپ کا شکریہ کہ آپ نے میرا علاج کر دیا اور میرے اوپر آپ نے احسان فرمایا، جب دنیا کا ادنیٰ ڈاکٹر جس کی طرف سے یہ بھی امکان ہے کہ غلط کر ڈالے اور یہ بھی امکان ہے کہ اپنی غرض کے لیے آپریشن کرتا ہو، جب وہ ہمیں تکلیف و مصیبت دے رہا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارا فائدہ اور مصلحت ہے، تو ہم اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں، تو حقیقی ڈاکٹر اللہ تعالیٰ کوئی بیماری ہمارے ہی فائدہ کے لیے دیتا ہے، تو کیا شکر نہیں کیا جا سکتا؟ اور وہ ہماری مصلحت کے لیے کبھی فقر و فاقہ دے تو کیا اس پر اس کا شکر نہیں ہو سکتا؟ بے شک ہو سکتا ہے، اس لیے فقیرِ شاکر سب سے افضل ہے۔

نِرا خوف شیطان کو بھی حاصل تھا

خوفِ خدا سے مقصود یہ ہے کہ آدمی معاصی اور گناہوں سے بچے، اگر خوف کے ذریعے گناہوں سے نہیں بچتا تو ایسا خوف شیطانی خوف ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ، فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الحشر:۱۶)

(جیسے شیطان انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر اور جب وہ کفر کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے بَری ہوں اور میں اللہ رب العالمین سے خوف کرتا ہوں۔)

دیکھیے! شیطان خود کہہ رہا ہے کہ وہ اللہ سے خوف کرتا ہے؛ مگر کیا یہ خوف اس کا معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں؛ کیوں کہ اس خوف کے ساتھ گناہ سے بچنا اور پرہیز کرنا نہیں پایا گیا، اس لیے خوف وہ معتبر ہے جو گناہ سے بچائے۔

اس پر مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ ایک مرتبہ جناب مقصود علی خان صاحب مرحوم، مدیر اعلیٰ روز نامہ ''سالار، بنگلور'' میرے پاس آئے اور وقتاً فوقتاً بڑی محبت سے میرے پاس آتے رہتے تھے اور جب بھی کوئی اشکال پیش آتا تو فون سے یا خود تشریف لاکر معلومات کرتے تھے، اسی طرح ایک بار آئے اور کہا کہ مولانا! قرآن پڑھ رہا تھا، ایک آیت پڑھتے ہوئے ٹھٹک گیا، پھر یہی آیت پڑھی: ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ اور کہنے لگے کہ شیطان کو جب خوفِ خدا حاصل ہے، تو اس کی بخشش کیوں نہ ہوگی؟ یہ شبہ دل میں آ گیا اور پریشان ہو کر آیا ہوں کہ اس کا جواب معلوم کروں، میں نے یہی عرض کیا کہ بخشش جس خوف پر ہے، وہ ایسا خوف ہے، جو انسان کو معاصی سے روکے، مطلق خوف کی کوئی فضیلت نہیں، اس پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ یہ بات مجھے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان تھا اور طرح طرح کے شبہات دل میں آتے تھے۔

الغرض اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ اللہ کا خوف اس لیے مطلوب ہے کہ اس سے گناہوں سے بچنے کی قوت حاصل ہوتی ہے اور اگر خوف تو ہو اور وہ گناہ سے نہ بچائے تو ایسا خوف اللہ کے نزدیک نہ مطلوب ہے نہ محمود ہے؛ اسی لیے نبی

کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک دعا میں فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا یَحُوْلُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعَاصِیْکَ"

(اے اللہ! ہمیں تیرے خوف میں سے اتنا حصہ عطا فرما، جو ہمارے اور تیرے گناہوں کے درمیان آڑ بن جائے) (الجامع للترمذي:۳۴۲۴)

معلوم ہوا کہ خوف کی ضرورت اس لیے ہے کہ آدمی اللہ سے ڈر کر گناہوں سے باز آجائے۔

ایک سوال کا جواب

پوچھا گیا کہ حضرت! یہ کیسے معلوم ہو کہ خدا کی محبت ہمارے دل میں پیدا ہو چکی ہے؟ فرمایا: جب انسان، انسان سے محبت کرتا ہے تو کیا معلوم نہیں ہوتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دل کا میلان اس کی طرف زیادہ ہے، اسی کی فکر میں لگا ہوا ہے، یہ علامت ہے کہ کسی سے اس کو محبت ہوگئی ہے، اسی طرح جب اللہ سے محبت پیدا ہوگی تو ہمیشہ ذکر میں رہے گا، فکر میں رہے گا، دنیا کے دھندوں سے دور رہے گا اور اگر دنیا کے دھندوں میں رہے گا، تب بھی اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا۔ جیسے قرآن میں ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (النّور:۳۷)

(کچھ لوگ وہ ہیں جن کو اللہ کے ذکر سے نہ تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت غافل کرتی ہے)۔

اور جیسا کہ آپ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "سات آدمی قیامت کے دن عرش کے سایے میں ہوں گے، ان میں سے ایک وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا رہتا ہے" (الصحیح للبخاري:۶۶۰، الجامع للترمذي:۲۳۹۱)

یعنی وہ دنیا کے تمام کام کرے گا؛ مگر اس کا دل اللہ کی طرف ہوگا، ہمیشہ اسی کا استحضار

رہے گا، اذان ہو تو فوراً مسجد کی طرف لپکے گا، ان علامات سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کو اللہ سے محبت ہوگئی ہے۔ حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ نے اسی کو اس شعر میں کہا ہے:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اللہ والا بننے کے لیے دنیا چھوڑنا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننے کے لیے تجارت، بیوی، بچے، سب کچھ چھوڑنا ضروری ہے، یہ غلط بات ہے، شیطانی وسوسہ اور دھوکہ ہے؛ بل کہ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تجارت بھی کرتے تھے، ملازمت بھی کرتے تھے، بیویوں کے حقوق بھی ادا کرتے تھے، بچوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے، پھر بھی سب سے بڑے اللہ والے تھے، ان سے بڑا اللہ والا اور کون ہوسکتا ہے؟ اور مذہب اسلام بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ کاروبار اور تمام کام کرتے ہوئے تم اللہ والے بن کر رہو اور سب کے حقوق ادا کرو اور یہی ذریعہ ہے اللہ تک پہنچنے کا، اس کے برخلاف اگر کوئی اپنے اہل وعیال کے، ماں باپ کے، پڑوسیوں کے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرے، تو وہ حقیقی اللہ والا ہی نہیں۔

چناں چہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ کچھ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آکر ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے لگے، جب ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اصول وطریقہ بتایا گیا کہ آپ نماز بھی پڑھتے ہیں اور کبھی آرام بھی کرتے ہیں، کبھی روزے رکھتے ہیں اور کبھی افطار کرتے ہیں؛ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، تو انھوں نے اس کو بہت کم شمار کیا اور کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو دوسری ہے؛ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بخشے

بخشائے ہیں، پھر ان میں سے ایک کہنے لگا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا: میں ''صوم دہر'' رکھوں گا (بالکل افطار نہیں کروں گا)، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا، شادی نہیں کروں گا، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تشریف لائے اور فرمایا: خدا کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سے بڑا متقی ہوں؛ لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، شادی بھی کرتا ہوں، پس جو میرے طریقے سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔

(الصحیح للبخاري:۵۰۶۳،الصحیح للمسلم:۱۴۰۱)

اس حدیث میں بڑی عبرت ہے؛ کیوں کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رأس الاولیا ہونے کے باوجود، دنیوی سارے کام انجام دیتے تھے، تمام کے حقوق ادا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والا بننے کے لیے راہب بننا ضروری نہیں؛ بل کہ جائز بھی نہیں۔

اسی لیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا بننا دنیا چھوڑنے سے ہی ہوتا ہے؛ یہ غلط ہے، اصل یہ ہے کہ محنت وکوشش کی جائے احکام الٰہی پر چلنے کی، یہی اللہ والا بننا ہے؛ ورنہ تو بعض لوگ دنیا چھوڑ کر بھی اللہ والے نہیں بنتے۔ مثلاً بعض لوگ مدرسے کے ماحول میں جو دینی، اصلاحی ماحول ہوتا ہے، رات دن'' قال اللّٰہ وقال الرسول ''ہوتا ہے، اس کے باوجود بعض طلبہ ہیں، جو نماز تک نہیں پڑھتے۔

معلوم ہوا اللہ والا بننے کے لیے اصل فکر وتڑپ ہے، آپ سب کچھ کرتے ہوئے بھی اگر تڑپ وفکر ہو، تو اللہ والے بن سکتے ہیں، دنیا کے جھمیلے ومصروفیات آپ کو اللہ والا بننے سے نہیں روک سکتے۔

ہم تو سنار تھے لوگوں نے لوہار سمجھ لیا

ایک مرتبہ مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: میں ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک آدمی آیا اور تعویذ مانگنے لگا، حضرت رحمۃ اللہ نے کہا کہ جاؤ! بھائی جان سے لے لو (بھائی جان سے مراد حضرت والا کے صاحب زادے ہیں، جن کو طلبا اور عوام سب بھائی جان کہتے تھے) وہ شخص باہر گیا، پھر تھوڑی دیر بعد آ کر کہنے لگا، حضرت! آپ ہی دے دیجیے، حضرت والا رحمۃ اللہ نے پھر فرمایا: ''بھائی جان سے لے لو، میں تعویذ دیا نہیں کرتا'' وہ شخص پھر باہر گیا اور کچھ دیر کے بعد پھر آ کر اسی طرح کہا کہ حضرت! تعویذ آپ ہی دے دیجیے، حضرت رحمۃ اللہ نے پھر وہی جواب دیا اور بھیج دیا اور میری طرف دیکھ کر فرمانے لگے: ''ہم تو سنار تھے، لوگوں نے ہمیں لوہار سمجھ لیا'' یعنی کوئی سنار کے پاس لوہے کا کچھ کام بنانے لے جائے، تو یہ "وضع الشيء في غير محله" کی قبیل سے ہوگا، اسی طرح آج لوگ اللہ والوں کے پاس بہ جائے اپنی اصلاح کرانے کے اور معرفت الٰہی حاصل کرنے کے، دینی باتیں معلوم کرنے کے، وصول الی اللہ کے طرق معلوم کرنے کے، تعویذ کے بارے میں پوچھنے جاتے ہیں، دنیا کے بارے میں معلوم کرنے جاتے ہیں کہ حضرت میرا فلاں کام رک گیا ہے، حل کر دیجیے، وغیرہ وغیرہ۔

خوفِ خدا کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ خوف کے فضائل بیان فرمائے ہیں اور ایک جگہ اس کی ضرورت اور اس پر مرتب ہونے والے ثمرے کا ذکر فرمایا ہے، میں پہلے آپ کو وہ آیت سناتا ہوں، جو ﴿سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ﴾ میں اللہ نے ذکر فرمائی ہیں:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى.﴾ (النّازعات: ۳۹-۴۰)

(جو آدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کھاتا ہے اور اپنے نفس کو گناہوں سے بچاتا ہے، تو اس کے لیے جنت، ٹھکانہ بنادی جاتی ہے)

معلوم ہوا کہ خوفِ خدا وہ چیز ہے جس پر اللہ کی جانب سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ آدمی کو جنت مل جائے؟!!

محترم حضرات! یہ بشارت عظیم ترین بشارت ہے، ہر آدمی کی یہ خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے، کوئی یہ نہیں چاہتا کہ وہ جہنم میں جائے، جہنم انتہائی خطرناک چیز ہے، مؤمن کی کیا مجال کہ وہ اس بات کی خواہش کرے کہ وہ جہنم رسید کردیا جائے؟ بل کہ ہر مومن اپنے دل میں اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کے اندر اس بات کی دعا کی ہے:

"اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ ، وَ مَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ ، وَ أَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ وَ مَا قَرَّبَ إِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ أَوْ عَمَلٍ ."

(اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور اس چیز کا سوال کرتا ہوں، جو مجھے جنت کے قریب کرنے والی ہو، خواہ عمل میں سے ہو یا قول میں سے ہو۔)

(سنن أبي داؤد: ۱۲۶۵، مسند أحمد: ۱۴۰۲)

جو طرزِ زندگی جنت کے قریب کرنے والی ہو، اللہ سے اس کو مانگا جارہا ہے کہ مجھ کو وہ عمل عطا فرما اور اے اللہ! میں دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں اور اس کے ساتھ اس چیز سے بھی پناہ مانگتا ہوں، جو جہنم کے قریب کرنے والی ہو، جو عقائد، جو اعمال اور جو طرزِ زندگی مجھے جہنم کے قریب لے جانے والی ہو، اس سے بھی پناہ مانگتا ہوں۔

الغرض جنت کی خواہش ہر مومن کے دل کی آواز ہے اور جہنم سے بچنا بھی اس کے دل کی آواز ہے؛ لیکن اس کا طریقہ کیا ہو؟ طریقہ یہی ہے جو قرآن نے بتایا:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى.﴾ (النّازعات: ۳۹-۴۰)

اللہ کے سامنے جواب دہی کا خوف کہ مجھ سے پوچھا جائے گا اور سوال کیا جائے گا اور مجھے اس کا جواب دینا ہوگا، جب آدمی کے دل میں اس بات کا خوف آئے گا، وہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا اور جو ایسا کرے گا اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت مولانا اسد اللہ صاحب رحمہ اللہ کی تواضع

ایک واقعہ سناتا ہوں، ہمارے زمانے کے ایک بزرگ ہیں، حضرت مولانا اسد اللہ خان صاحب رحمہ اللہ، جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی رحمہ اللہ اور حضرت اقدس مفتی مظفر حسین صاحب رحمہ اللہ ہیں، ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ عمدہ اور نئے کپڑے پہن کر کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک جھاڑو دینے والی جھاڑ رہی تھی، حضرت رحمہ اللہ کے اوپر کچھ دھول وغیرہ لگ گئی اور کپڑے کچھ میلے ہوگئے اور حضرت رحمہ اللہ بھی بڑے نظیف ولطیف مزاج انسان تھے، کئی کئی مرتبہ وضو کرتے تھے، جب پوچھا گیا، تو فرمایا کہ دل کو سکون نہیں ہوتا، چناں چہ اس دھول وغیرہ کی وجہ سے اس جھاڑنے والی کو ڈانٹ دیا اور کہا کہ تجھے جھاڑو دینا بھی نہیں آتا؟ میرے کپڑے میلے اور گندے کردیے، یہ کہہ کر اپنی جگہ پر آ گئے، جب اپنی جگہ بیٹھے تو دل بے چین ہوتا ہے، بے قراری پیدا ہوتی ہے، طلبہ کو بلاتے ہیں، خدام کو

آواز دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دیکھو بھائی! جھاڑو دینے والی کہاں ہے؟ اس کو بلا کر لے آؤ، سب خدام اِدھر اُدھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے ؛مگر وہ ملی ہی نہیں، طلبہ نے آکر کہا کہ حضرت ! وہ تو نہیں ملی، تو حضرت رَحِمَہُ اللہُ بے چین ہو گئے ، فوراً اٹھے اور خود اس کو تلاش کرنے لگے، وہ کسی سڑک پر جھاڑو دے رہی تھی، آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے کہا کہ میں نے تجھے ڈانٹ دیا تھا، مجھے خدا کے لیے معاف کر دینا، مجھے حق نہیں کہ میں تجھے ڈانٹوں۔

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ کا ایک واقعہ

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ کا واقعہ ہے کہ بادشاہ ہارون رشید رَحِمَہُ اللہُ کا دربار تھا، اس کی مجلس میں مذاکرہ ہو رہا تھا اور بڑے بڑے علما وہاں موجود تھے ، امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ اس وقت چھوٹی عمر کے تھے؛ لیکن بڑے شوق کے ساتھ اس مجلس میں جا کر بیٹھ گئے ، ہارون رشید رَحِمَہُ اللہُ نے لوگوں سے سوال کیا کہ تم لوگ جو بڑے علما ہو، بڑے بڑے مشائخ ہو، قران و حدیث کا علم رکھتے ہو، میرے بارے میں بتاؤ کہ میں جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں جاؤں گا؟ لوگوں نے کہا: اس کا جواب ہم کیسے دے سکتے ہیں؟ قرآن سے مسئلہ تو بتا سکتے ہیں؛ لیکن کسی کی قسمت کا فیصلہ نہیں بتا سکتے، ہاں! احکام بتائے جا سکتے ہیں، زندگی میں انسان کو کس رنگ سے کس ڈھنگ سے رہنا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کس چیز سے راضی ہوتا ہے اور کس سے ناراض ہوتا ہے؟ یہ تو بتا سکتے ہیں؛ لیکن یہ سوال کہ ایک آدمی جنت میں جائے گا یا دوزخ میں جائے گا؟ یہ تو غیب کی بات ہے، کسی انسان کے بارے میں قرآن وحدیث کا جاننے والا غیب کی بات کیسے بیان کر سکتا ہے؟

امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ جو ابھی نو عمر تھے ، انھوں نے عرض کیا کہ حضور! اگر

اجازت ہو تو میں اس کا جواب دے سکتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ ضرور دیجیے، اللہ تعالیٰ نے امام شافعی رحمۃ اللہ کو بڑی بصیرت اور فراست سے نوازا تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ نے کہا کہ حضور! آپ تو سوال کرنے والے ہیں اور میں جواب دینے والا ہوں، آپ اوپر بیٹھے ہیں اور میں نیچے بیٹھا ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لیے آپ نیچے اتر آیے اور مجھے اوپر بٹھا دیجیے (یہ اولیاء اللہ جو ہوتے ہیں کسی سے ڈرتے نہیں ہیں، بادشاہ ہو تو کیا ہوا؟ اس لیے کہ جو "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کی رٹ دن رات لگاتا ہو، ہر وقت اس کی زبان پر "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کا نعرہ ہو اور دل میں اس حقیقت کو جمالیا ہو کہ اللہ سے بڑا کوئی نہیں ہے، وہ کسی کو بڑا سمجھ ہی نہیں سکتا) امام شافعی رحمۃ اللہ کہنے لگے کہ آپ سائل ہیں اور میں مجیب ہوں، جواب دینے والے کا مقام اونچا ہوتا ہے، سوال کرنے والے کا مقام چھوٹا ہوتا ہے؛ اس لیے آپ کو نیچے ہونا چاہیے، بادشاہ نے اس چھوٹے سے بچے کی یہ گفتگو سنی اور کہا کہ اس بچے کو اوپر بٹھا دو اور ہمارے لیے نیچے انتظام کردو، امام شافعی رحمۃ اللہ کو اوپر تخت پر بٹھا دیا گیا اور بادشاہ نیچے اتر گیا، امام شافعی رحمۃ اللہ نے کہا کہ اب آپ اپنا سوال پیش کریں؟ جب سوال پیش کیا تو امام شافعی رحمۃ اللہ نے کہا کہ میں ایک سوال آپ سے کرتا ہوں، آپ بتائیں کہ کیا زندگی میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے خوف سے آپ گناہوں سے بچ گئے ہوں اور وہاں گناہ کرنے سے کوئی چیز مانع بھی نہیں رہی ہو، جو جی چاہے آپ کرسکتے ہوں؟ لیکن محض اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے آپ نے گناہ کو چھوڑ دیا ہو، کبھی ایسی نوبت آپ کو آئی ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ ہاں بسا اوقات ہوا ہے، کوئی روک ٹوک نہیں تھی، کوئی دیکھنے والا تک نہیں تھا؛ لیکن اس کے باوجود میں نے گناہوں سے اپنے آپ کو بچایا ہے کہ کوئی تو مجھ کو نہیں دیکھ رہا ہے؛ لیکن اللہ مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اس پر امام شافعی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اب میں آپ کے سوال کا

جواب دیتا ہوں کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں، لوگوں نے کہا کہ آپ یہ بات کس بنیاد پر فرما رہے ہیں اور اس کی کیا دلیل ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ نے یہی آیت تلاوت کی:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۞ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى.﴾ (النازعات: ۳۹-۴۰)

(جو آدمی اللہ کے خوف سے ڈر گیا اور اللہ کے خوف کی وجہ سے گناہوں سے بچ گیا تو جنت میں اس کا ٹھکانہ بنا دیا جاتا ہے۔)

امام شافعی رحمۃ اللہ نے کہا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان شاء اللہ جنتی ہیں۔

معلوم ہوا بھائیو! اللہ کا خوف اتنی قیمتی چیز ہے، اتنی بھاری چیز اور عظیم الشان چیز ہے کہ جس آدمی کے دل میں اللہ کا خوف آجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا فیصلہ لکھ دیتے ہیں۔

ایک عبرت آموز حدیث

خوفِ خدا کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس شخص کی مغفرت کر دی جاتی ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں، جس کو امام منذری رحمۃ اللہ نے "الترغیب والترہیب" میں روایت کیا ہے۔

وہ یہ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی "کفل" نام کا تھا، جو ہر قسم کی برائی میں طاق تھا اور ہر برائی کیا کرتا تھا، ایک دن اس کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے اس سے کہا کہ اگر تم مجھے اتنے روپے دے دو، تو میں اپنے آپ کو تمھارے حوالے کر دوں گی اور تم کو مجھ سے اپنی خواہش پوری

کرنے کا حق ہوگا، وہ شخص پہلے ہی سے برائی کا عادی تھا، اسے یہ موقعہ غنیمت نظر آیا اور اس نے اس عورت کو رقم دینے کا وعدہ کرلیا اور اس سے اپنی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی کمرے میں لے گیا، جب برائی کا وقت آیا تو وہ عورت کانپنے لگی اور اس پر خوف و دہشت طاری ہوگئی، اس نے اس عورت سے پوچھا کہ تو کیوں خوف زدہ ہے اور کانپ رہی ہے؟ وہ کہنے لگی کہ میں نے میری پوری زندگی میں کبھی یہ حرکت نہیں کی اور آج مجھے اس حرام و ناجائز کام کو اس لیے کرنا پڑ رہا ہے کہ میرے بچے گھر میں بھوکے پیاسے ہیں اور ان کا کوئی کفیل نہیں ہے اور پکانے کا کوئی سامان نہیں، میں انتہائی مجبور ہوکر سوچنے لگی کہ کیا کرسکتی ہوں، تو میرے ذہن میں آیا کہ میں اپنے آپ کو کسی کے حوالے کرکے اور اپنی عصمت اور اپنی پاک دامنی کو بیچ کر اس سے جو کچھ روپیے حاصل ہوجائیں، اس سے بچوں کی پرورش کروں، تو ان کی ضرورت اور ان کے کھانے کا نظام کرنے کے لیے میں نے اس برائی کا ارادہ کیا؛ مگر مجھے اللہ کا خوف ہورہا ہے اور اس لیے مجھ پر کپکپی طاری ہے۔

عورت دل سے کہہ رہی تھی، تو اس کی بات دل پر اثر انداز ہوئی اور عورت کی یہ داستان سن کر اور اس کا اللہ سے یہ خوف دیکھ کر، اس مرد کے دل میں بھی اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہوگیا، اور کہنے لگا کہ تو صرف ایک بار گناہ کا ارادہ کرکے اللہ سے اس قدر خوف کررہی ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں نے پوری زندگی اس کی نافرمانی میں اور معصیت میں گزاری ہے، مجھے اللہ کا تجھ سے زیادہ خوف کرنا چاہیے؛ اس لیے میں توبہ کرتا ہوں کہ آج سے کبھی گناہ نہیں کروں گا اور میں نے جو تجھ سے رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، وہ بھی تجھ کو دوں گا۔ اب اس نے اس عورت کو وہ رقم بھی دے دی اور برائی سے توبہ بھی کرلی، اس عورت کو بڑی خوشی ہوئی کہ ایک آدمی کو اس کی طرف سے

ہدایت ملی ۔دیکھیے !ایک عورت اگر ہدایت کے راستے پر لانا چاہے، تو بڑے بڑے بدکاروں کو بھی ہدایت پر لے آئے۔

غرض وہ عورت وہاں سے واپس ہوگئی اور یہ آدمی اس کے جانے کے بعد ندامت کے ساتھ اللہ کے سامنے روکر، گڑگڑا کر، اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا اور اسی حالت میں اسی رات اس کا انتقال ہوگیا، بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت جاری تھی کہ جو آدمی اچھا ہوتا، اس کی اچھائی کا ذکر قدرت سے اس کے دروازے پر لکھ دیا جاتا اور اگر کوئی برائی کرتا تو اس کے دروازے پر اس کی برائی کا ذکر کردیا جاتا تھا اور یہ ''کفل'' نامی شخص تو اتنا برا کہ اس کے دروازے پر روزانہ کچھ نہ کچھ اس کی برائی لکھی ہوئی ہوتی تھی کہ آج اس نے زنا کیا ہے اور آج اس نے شراب پی ہے یا اور کوئی برائی کی ہے، سارے شہر میں اس کی رسوائی ہوتی اور سب لوگ کہتے تھے کہ یہ کیسا برا آدمی ہے؟ اور لوگ اسی وجہ سے اس سے ڈرتے اور دور رہتے تھے۔

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ رات کو اس کا انتقال ہوگیا اور صبح لوگ اٹھ کر دیکھتے ہیں کہ اس کے دروازے پر لکھا ہوا ہے کہ " قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لِلْكِفْلِ " اللہ تعالیٰ نے کفل کی مغفرت کردی اور لوگ پڑھتے ہوئے جارہے تھے، گزرنے والے روزانہ دیکھا کرتے تھے کہ اس کے دروازے پر کبھی کچھ برائی تو کبھی کچھ اور برائی لکھی ہوتی تھی؛ مگر آج عجیب حالت ہے کہ اللہ نے کفل کی مغفرت کردی، لوگ کہنے لگے کہ آج اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا کہ اتنا برا آدمی، اتنا شریر و فاسق آدمی اور اللہ نے اس کی مغفرت کردی! جب لوگوں نے تحقیق کی تو اس عورت کا واقعہ معلوم ہوا، خود عورت نے آکر بتایا کہ رات ایسا ایسا واقعہ ہوا تھا، تب لوگوں کو سمجھ میں آیا کہ اللہ نے اسی لیے اس کی مغفرت کردی۔

(الترغیب والترھیب:۲۵۸/۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خوف اور ڈر اور اس کی بنا پر گناہوں سے پرہیز، بڑی مبارک چیز ہے۔

ایک عظیم علم اور نکتہ

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے خوف کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (النازعات:۳۹)

(جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کرے اور اس کے نتیجے میں نفسانی خواہشات سے رک جائے۔)

اس میں ایک عظیم علم اور نکتہ ہے، وہ یہ کہ اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے سامنے جانے کا، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا، اللہ کے سامنے جا کر بیان دینے کا اور اپنے گناہوں کے سلسلے میں جو سوال ہوگا، اس کے جواب دینے کے بارے میں جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ تعالی اس کو جنت میں ٹھکانہ عطا فرماتے ہیں؛ اس لیے آدمی کو ایک طرف اپنے گناہوں کا خیال کرنا چاہیے کہ مجھ سے گناہ تو نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر ہو رہے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ ہے کہ معافی طلب کرے اور دوسرے نمبر پر یہ کہ اللہ کا ڈر اپنے دل کے اندر پیدا کر کے اس سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ جو شخص اللہ کے ڈر کے مارے گناہوں سے بچے گا، اللہ اس کو ضرور جنت میں داخل کرے گا۔

آج اللہ کا ڈر لوگوں کے قلوب سے نکل گیا؛ اس کی وجہ سے بے تحاشا گناہ کرتے چلے جا رہے ہیں، ان کو خیال تک نہیں آتا کہ اللہ کے سامنے جانا ہے اور حاضری دینا ہے اور وہاں سوال و جواب ہوگا، بغیر کسی پردے کے، بغیر کسی درمیانی چیز کے، اللہ تعالی بہ راہِ راست سوال کرے گا اور ہمیں وہاں اس کا جواب دینا ہوگا، یہ

نہیں کہ درمیان میں کوئی فرشتہ ہوتا ہو اور ادھر سے اللہ پوچھتا ہو اور ادھر سے جواب لے کر کوئی فرشتہ اللہ کو بتاتا ہو؛ بل کہ حدیث پاک میں آتا کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اللہ قیامت کے دن بغیر کسی ترجمان کے بہ راہِ راست سوال کرے گا۔

(الصحيح للبخاري:۱۳۲۴،مسند أحمد:۱۷۵۳۵)

ذرا اندازہ کرو! اگر کسی بادشاہ کا محل ہو، وہاں پر اس کی فوج موجود ہو اور وہ پورے کروفر کے ساتھ وہاں بیٹھا ہو، لاؤلشکر اور ساری طاقت وہاں پر موجود ہو اور ہم کو مجرم بنا کر اس کے دربار میں لے جایا جائے، تو اس وقت ہماری کیا حالت ہوگی؟ اور کیا کیفیت ہوگی؟ ایک طرف شرم وحیا، دوسری طرف ڈر وخوف پیدا ہوگا، جس کی وجہ سے ہمارا دل کانپ جائے گا، نیند اڑ جائے گی، چین ختم ہو جائے گا اور ہم یہ چاہیں گے کہ ہمیں زندہ رہ جانے کے بہ جائے موت آ جائے تو کتنا اچھا ہو؟!! اس لیے کہ اس قدر ذلت ورسوائی بادشاہ کے دربار میں مجرم بنا کر لے جایا گیا ہے، یہ کیسے برداشت ہوگی؟!!

بھائیو! جب دنیا کے بادشاہوں کا یہ حال ہے، تو سوچو کہ اللہ کے دربار کا کیا حال ہوگا؟ اس کے دربار میں، قیامت کے میدان میں دنیا کے پہلے انسان سے لے کر دنیا کے آخری انسان تک سب جمع ہوں گے اور اللہ کے فرشتے بھی وہاں جمع ہوں گے، دیگر مخلوقات بھی وہاں ہوں گی اور علی الاعلان حساب لیا جائے گا، ڈھانک کر اور چھپا کر نہیں لیا جائے گا اور حساب پوری مخلوق کے سامنے آ جائے گا۔

اب بتاؤ کہ کیا حال ہوگا؟ ایسے موقعے پر اگر ہمارے سے سوال ہو اور جواب کا مطالبہ ہو، تو ہمارے پاس اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟ اس لیے سب سے پہلے آدمی کو

ڈرنا چاہیے اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ﴾ کا مطلب یہی ہے کہ مجھے اللہ کے سامنے جانا ہے، کھڑا ہونا ہے، ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے، اس کا خیال ہو۔

خوف اور محبت کی ایک عجیب مثال

یہاں ایک بات مزید عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ کاروں، بسوں اور دیگر سواریوں میں دو قسم کی طاقت ہوتی ہے، ایک سے کار کو آگے بڑھایا جاتا ہے اور دوسری سے اس کو روکا جاتا ہے اور یہ دونوں طاقتیں کار اور بس وغیرہ سب کے لیے ضروری ہیں؛ تاکہ یہ اپنی منزل تک پہنچ سکیں، اگر آگے لے جانے والی قوت نہ ہو، تو یہ سواریاں چل نہ سکیں گی اور اگر روکنے کی قوت نہ ہو، تو یہ سواریاں ہر وقت خطرے کا شکار ہوتی رہیں گی، اسی روکنے کی قوت کو بریک (Brake) کہا جاتا ہے۔

اب سمجھیے کہ اسی طرح انسان کو بھی اپنے روحانی و ایمانی سفر کے لیے اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے دو قسم کی قوت چاہیے: ایک نیکیوں کی راہ پر چلانے والی قوت اور دوسری گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت: نیکی پر چلانے کی قوت کا نام ہے "محبتِ الٰہیہ" اس طاقت سے انسان اپنے کو نیکی کی راہ پر چلا سکتا ہے، اللہ کی محبت وہ عجیب شئ ہے کہ ہزار تکالیف ہوں؛ مگر انسان اللہ کی محبت میں نیکی اور اطاعت کی راہ پر چلنے لگتا ہے۔ "از محبت تلخہا شیریں شود" اور گناہوں کے خطرات سے بچانے والی قوت کا نام ہے "خوفِ خداوندی"، یہ اللہ کا خوف انسان کو گناہوں سے بچاتا ہے؛ اس لیے میں کہتا ہوں کہ خوف کی مثال ایسی ہے جیسے کار اور بس میں بریک (Brake) ہوتا ہے کہ جب کوئی خطرے کی بات سامنے آئے تو اس کا استعمال کیا جاتا ہے، کسی انسان کے سامنے کوئی گناہ کی بات آئے اور اس کو اپیل کرے تو اس قوت کو

استعمال کر کے ان ایمانی وروحانی خطرات سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

خوف کی دو قسمیں

ایک اہم نکتہ سن لیجیے! وہ یہ کہ علما نے لکھا ہے کہ خوفِ خدا دو قسم کا ہوتا ہے: ایک یہ کہ بندے کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی طرف نظر کرتے ہوئے خوف پیدا ہو اور دوسرا یہ کہ اللہ کی سزاؤں اور عذابوں اور اس کی طرف سے گناہوں پر بیان کی ہوئی وعیدوں پر نظر کرتے ہوئے خوف ہو۔

اگر چہ یہ دونوں قسم کے خوف معتبر ہیں اور ان دونوں پر اللہ کی طرف سے فضیلت ملے گی؛ مگر جو خوف صرف اللہ کی جلالت وعظمت کے پیش نظر ہو، اس کا درجہ بہت اونچا ہے؛ کیوں کہ یہ خوف کسی اپنی غرض کی بنا پر نہیں ہے؛ بل کہ صرف اور صرف اللہ کی بڑائی و بزرگی کی وجہ سے ہے اور عارفین کا خوف اسی قسم کا ہوتا ہے۔

امام غزالی رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی عظمت وجلالت کی وجہ سے خوف کا ہونا، ایک بلند ترین مقام ہے اور یہ خالص موحدین وصدیقین کا مقام ہے۔

الغرض کوئی اللہ کا خوف اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہ کی وجہ سے جہنم میں ڈالے گا اور سزا دے گا، تو یہ خوف بھی ٹھیک ہے اور اس پر بھی ثواب ہے، مگر اعلیٰ و افضل مقام یہ ہے کہ اللہ کا خوف وڈر اس کی جلالت وعظمت اور اس کی صفات کا خیال کرتے ہوئے ہو اور اس سے بھی اعلیٰ مقام یہ ہے کہ دونوں قسم کا خوف ہو، حضراتِ انبیا علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم واولیاء اللہ سے دونوں قسم کے خوف کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ حضرات ایک طرف اللہ کی جلالت وعظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا خوف کرتے تھے، تو دوسری طرف اس لیے بھی اللہ کا خوف کرتے تھے کہ اس کا عذاب اور اس کی سزا بھی بڑی اور شدید ہے جس کا تحمل نہیں کیا جا سکتا۔

رسول خدا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا خوف

حدیث میں آتا ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ کا اس قدر ڈر و خوف تھا کہ بسا اوقات تیز و تند ہوا چلتی یا کوئی سیلاب کی شکل ہو جاتی یا زور زور سے بارش آنے لگتی یا بجلیاں چمکتیں اور کڑکتیں، تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دل پر اس کی وجہ سے ایک کیفیت طاری ہو جاتی، خدا کا ڈر اور خوف غالب آجاتا اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دوڑ کر مسجد کی طرف جاتے اور اللہ کی عبادت میں لگ جاتے، بعض صحابۂ کرام نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ! آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں؟ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں قیامت برپا نہ ہو جائے۔

حضرت عائشہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا فرماتی ہیں کہ میں نے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا: کیا بات ہے کہ آسمان پر جب بادل آجاتا ہے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا رنگ بدل جاتا ہے؟ اور جب بارش ہو جاتی ہے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی یہ کیفیت بدل جاتی ہے؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اے عائشہ! مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ قومِ عاد کی طرح اللہ تعالیٰ عذاب نازل فرما دیں کہ قومِ عاد پر عذاب بادل کی شکل میں آیا تھا، انھوں نے یہ سمجھا کہ اب بارش ہونے والی ہے اور کہنے لگے ﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (اب یہ بادل بارش برسائے گا) مگر اللہ نے اس کے ذریعے ان پر پتھر برسا کر ان کو ہلاک کر دیا، حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ جب بارش ہو جاتی ہے، تو مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ بارش ہو رہی ہے، اللہ کا عذاب نازل نہیں ہو رہا ہے۔

(الصحيح للبخاري:٢٩٦٧،سنن أبي داؤد:٤٤٣٤)

ہماری بے خوفی وغفلت

حضرات! آج سخت ہواؤں کے جھکڑ چلتے ہوں، خوب بارش ہوتی ہو، سیلاب اور طوفان ہو یا سونامی جیسا کوئی واقعہ پیش آتا ہو، مختلف حوادثات پیش آتے ہوں؛ لیکن ہمارے دلوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا یعنی ہم بے حس ہوگئے ہیں، گویا ہم کو اطمینان ہوگیا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی معاملہ ہونے کا نہیں۔

یہ بے خوفی خطرناک ہے، قران کریم نے فرمایا کہ ذرا سوچو اور دیکھو کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کو اطمینان ہو اور اللہ تمھارے اوپر پتھروں کی بارش نازل کردیں۔

﴿ءَ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَّخسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ۝ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا، فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ.﴾ (الملك: ١٦-١٧)

حضرات! غور کیجیے کہ اللہ کے برگزیدہ نبی کو ہوا اور بادل کی وجہ سے اللہ کا خوف ہو رہا ہے اور ہم کو کوئی خوف نہیں ہوتا، گناہ بھی جاری اور اطمینان بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہے اور کھانا بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہے اور سونا بھی جاری ہے، گناہ بھی جاری ہے اور تجارت بھی جاری ہے۔

خوفِ خدا بھی مانگنا چاہیے

اسی لئے اللہ سے اس کا خوف بھی مانگنا چاہیے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ سے خوف مانگتے تھے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا آئی ہے:

"اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ." (الجامع للترمذي: ٣٤٢٤)

(اے اللہ! ہم کو اپنے خوف میں سے اتنا حصہ عطا فرما، جو ہمارے اور تیری نافرمانیوں کے درمیان آڑ بن جائے [اور ہم گناہ نہ کرنے پائیں])

اور ایک حدیث میں فرمایا:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ الْأَشْيَاءِ إِلَيَّ وَاجْعَلْ خَشْيَتَكَ أَخْوَفَ الْأَشْيَاءِ عِنْدِيْ" (کنز العمال:۴/۹۰: حدیث:۳۶۴۵)

(اے اللہ! تو اپنی محبت میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب بنادے اور اپنا خوف وڈر تمام چیزوں سے زیادہ خوفناک بنادے۔)

معلوم ہوا کہ اللہ سے اس کی بھی دعا کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنا خوف عطا فرما؛ کیوں کہ جب آدمی کے دل میں اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اس کا ڈر اور خوف آجاتا ہے یا وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ میری حرکتوں پر اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی، تو اس کی وجہ سے وہ گناہوں سے ضرور بچے گا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خوفِ خدا

ہمارے اسلاف کی سیرت کا اس لحاظ سے مطالعہ کریں کہ وہ کیسا خوف رکھتے تھے؟ اور آقائے نامدار، تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کریں، حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے سینے میں رونے کی وجہ سے ایک آواز تھی، جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ایسی آواز تھی، جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے۔

(السنن للنسائي :۱۱۹۹،السنن لأبي داؤد :۷۶۹، مسند أحمد:۱۵۷۲۲)

یہ آواز دراصل خوف وخشیت کی بنا پر رونے کی وجہ سے تھی اور عام طور پر یہ بات

اس وقت ہوتی تھی جب کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نماز میں ہوتے تھے۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر خوفِ آخرت

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بہت بھوکے ہوگئے، کئی دن کا فاقہ تھا، یہاں تک کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس بے چینی اوراضطراب کی کیفیت نے گھر کے باہر نکلنے پر مجبور کردیا،اس وقت اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کیا کیفیت ہوگی؟! کیا حالت ہوگی ؟! آج ہم لوگ کتنا کھاتے ہیں؟! کیسی کیسی نعمتیں ہم کودی جاتی ہیں؟! اورصرف کھانا ہی نہیں کھاتے بل کہ پھل پھلاریاں اورمختلف چیزوں کاانتظام بھی ہوتا ہے، یہ ساری کیا اللہ کی نعمتیں نہیں ہیں؟ یہاں حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ معاملہ ہے کہ کئی دن گزر جاتے ہیں ،کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں ،گھر کے اندر چولہا تک نہیں جلتا، جو کچھ کھجور وغیرہ اس طرح کی چیزیں مل جاتیں، اسی کو کھالیتے ہیں، پکانے کے لیے کوئی چیز میسر نہیں ہوتی تھی۔ الغرض حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بے چین وبے تاب ہوئے ،دوپہر کا وقت تھا، ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے ملاقات ہوگئی، حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان سے پوچھا کہ دوپہر کے وقت باہر کیسے آنا ہوا؟ ابوبکر! کیا بات ہے؟ یہ وقت تو آرام کرنے کا ہے، ابوبکر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے عرض کیا: یارسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بھوک برداشت نہیں کرسکا ؛اس لیے مجبور ہوکر باہر نکل آیا ہوں، حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے، اسی چیز نے مجھے بھی باہر نکالا ہے، اب یہ دونوں حضرات مل کر آگے بڑھے، کچھ فاصلے پر جانے کے بعد حضرت عمر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے ملاقات ہوئی، حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پوچھا کہ عمر! کیا بات ہے؟ دوپہر کی اس سخت گرمی میں باہر کیسے آنا ہوا؟ یہ تو آرام

کا وقت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! کئی دن کا فاقہ ہے، آج بھوک برداشت نہیں ہوئی؛ اس لیے باہر نکل آیا ہوں، یہ دونوں حضرات کہنے لگے کہ عمر! جس چیز نے تم کو باہر نکالا ہے، اسی نے ہم کو بھی باہر نکالا ہے، پھر یہ تینوں مقدس حضرات جن میں ایک، تمام انبیا کے امام تھے اور یہ دونوں صحابہ جن کی عظمتِ شان تمام لوگوں کو معلوم ہے، یہ تینوں حضرات ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے یہاں گئے، ان کا نام حضرت ابوالہیثم رضی اللہ عنہ تھا، حضرت ابو الہیثم رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں پوچھا، اسی درمیان وہ بھی آگئے اور ان کی تو عید ہوگئی کہ ان کے یہاں آج اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھایا اور جلدی جلدی کچھ انگور اور کچھ کھجور کے خوشے توڑ کر لائے اور آپ کے سامنے رکھ دیا اور بکری ذبح کرنے چاقو اُٹھائی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دودھ والی کو ذبح نہ کرو، چناں چہ ایک بکری ذبح کی اور جلدی سے کچھ روٹیاں تیار کروائیں اور سالن، گوشت اور روٹی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان دونوں حضرات نے کھایا اور کھانے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم ان نعمتوں کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے، پھر ﴿سُوْرَةُ التَّكَاثُر﴾ کی آیت تلاوت فرمائی: ﴿ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾ قیامت کے دن ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کیا کیا کھائے تھے؟ کیا کیا مزے لوٹے تھے؟ ہم نے کیا کیا نعمتیں دی تھیں؟

(الصحیح للمسلم:۳۷۹۹، الجامع للترمذي :۲۲۹۲)

ایک اور موقعہ پر اسی طرح کا واقعہ پیش آیا، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور

یہ دونوں حضرات، حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، انھوں نے کھانے کا انتظام کیا، آپ نے کھایا، پھر آپ کو رونا آ گیا، حتی کہ ہچکیاں آنے لگیں، اس منظر کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی رونا آ گیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاد رکھو! جو کچھ کہ ہم نے کھایا ہے، اللہ کے سامنے قیامت کے دن اس کا حساب دینا ہوگا۔ (الدر المنثور:۶۵۱/۸)

اس کو کہتے ہیں اللہ کا ڈر اور اللہ کی خشیت، آج ہم کتنے اطمینان کے ساتھ اس کی نافرمانیاں کرتے ہیں؟! جب کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وہ مقدس ترین ذات ہے، جن سے کسی گناہ کا صدور ناممکن ومحال ہے، آپ روتے ہیں اور گھبراتے ہیں۔

اس لیے نعمت استعمال کرنے کے بعد سوچو کہ اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس کا استعمال تم نے کیسے کیا؟ حلال طریقے سے کیا تھا یا حرام طریقے سے کیا تھا؟ اور یہ کہ ہماری فرماں برداری کے ساتھ کیا تھا یا نافرمانی کے ساتھ کیا تھا؟ اس سوال کا جواب جب تک نہ دیا جائے گا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا، یہ تھا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا خوف

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ و عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، یہ دونوں حضرات اپنے اندر بہت زیادہ اللہ کا خوف و ڈر رکھتے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کوئی پرندہ نظر پڑتا، تو خوف کی وجہ سے فرماتے:

"لَیْتَنِي مِثْلُکَ یَا طَائِرُ! وَلَمْ أُخْلَقْ بَشَراً. "

(اے پرندے! کاش میں تجھ جیسا ہوتا اور انسان بنا کر نہ پیدا کیا جاتا۔)

اسی طرح حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش! میں ایک درخت ہوتا کہ کاٹ دیا جاتا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اے کاش! میں مرنے کے بعد دوبارہ نہ اُٹھایا جاتا۔

حضرت ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس صحابہ کو پایا ہے جو سب کے سب اپنے اوپر نفاق کا اندیشہ کیا کرتے تھے۔

(الصحيح للبخاري: كتاب الإيمان)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ کا اس قدر خوف تھا کہ اپنے اوپر نفاق کا شبہ کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہوگیا ہوں؟!!

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ انھوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بلایا، یہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کون تھے؟ وہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جن کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں، جو کسی اور صحابی رضی اللہ عنہ کو نہیں بتائی تھیں؛ اس لیے ان کو رازدارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے، ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان کو بلایا اور کہا کہ حذیفہ! تم سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو کچھ باتیں بتائی تھیں اور ان میں یہ بھی بتایا تھا کہ منافقین کون کون ہیں؟ کہیں میرا نام تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں لیا تھا؟ اللہ اکبر!! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسی محبت تھی؟ کیسا تعلق تھا؟ اس کے باوجود ڈرتے ہیں، گھبراتے ہیں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ناراض رہے ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام منافقوں میں شمار کرادیا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خوف ان فضائل کے باوجود تھا، جو آپ کے بارے میں

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمائے ہیں، خود حضرت حذیفہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے ایک موقعے پر یہ بتایا تھا کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے آپ کو دروازہ فرمایا تھا کہ جب تک یہ دروازہ باقی رہے گا، امت کے اندر فتنوں کے آنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، یہ دروازہ فتنوں کو روکے گا؛ تاکہ کوئی فتنہ امت میں نہ آنے پائے؛ لیکن جب یہ دروازہ وہاں سے ہٹ جائے گا تو پھر اس کے ذریعے فتنے آنے شروع ہوجائیں گے، حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے کہا کہ ایک بات بتادو کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو فرمایا تھا میں دروازہ ہوں، کیا وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا؟ حضرت حذیفہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے کہا کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ فرمایا تھا کہ اس دروازے کو توڑ دیا جائے گا۔ (الصحیح للبخاري:۳۳۲۱، الصحیح للمسلم:۲۰۸)

مطلب یہ کہ شہادت ہوگی، ایک تو ہے دروازہ کھولنا، جو دروازہ کھلتا ہے، وہ بند بھی ہوگا؛ لیکن جو دروازہ ٹوٹ جاتا ہے، وہ ٹوٹ ہی جاتا ہے، اس کے بننے کا سوال ہی نہیں ہوتا، مطلب یہ کہ جب اس دروازے کو توڑ دیا جائے گا، تو امت میں فتنوں کا دور شروع ہوجائے گا، چناں چہ حضرت عمر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کی شہادت کے بعد امت میں فتنوں کا دور شروع ہوگیا، جن کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے۔

بھائیو! یہ ڈر، یہ اللہ تعالیٰ سے خوف، انسان کو راہِ ہدایت پر لاتا ہے، حضرات اولیاء خاص طور پر اللہ کا ڈر اپنے دلوں کے اندر رکھتے تھے، اسی ڈر کی وجہ سے گناہوں سے بچتے تھے، ان کو ہر وقت یہ ڈر و خوف لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم موت کب آجائے؟ اللہ کے سامنے حاضری ہوجائے، نہ معلوم میرے گناہوں کے بارے میں میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ کو جہنم میں پھینک دیا جائے۔

امام ابن مبارک رَحِمَہُ اللّٰہُ کا حال

حضرت عبد اللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللّٰہُ کا نام آپ نے سنا ہوگا، بہت بڑے

محدث اور فقیہ تھے اور بڑے بزرگ بھی تھے، جب ان کا آخری وقت آیا، اس وقت وہ اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، بے قراری تھی، شاگرد جمع تھے، عبد اللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہ نے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر زمین پر لٹا دو، شاگردوں نے کہا کہ حضرت! زمین پر کیوں لیٹنا چاہتے ہیں، اوپر تو ذرا آرام ہے، نیچے رہنے پر آپ کو تکلیف ہوگی۔ عبداللہ بن مبارک رَحِمَہُ اللہ نے فرمایا: نہیں! مجھ کو اٹھاؤ اور زمین پر ڈال دو! خیر حکم تھا، تو شاگردوں نے ان کو اوپر سے اٹھایا اور زمین پر ڈال دیا، ڈالتے ہی ان کی عجیب حالت ہوئی، چہرے کو اور گالوں کو زمین پر رگڑنے لگے اور اللہ سے خطاب کر کے کہنے لگے کہ اے اللہ! کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھ بوڑھے کو آپ جہنم میں ڈال دیں، اس بوڑھے پر رحم فرما! اس بوڑھے پر رحم فرما! بار بار یہی فرماتے چلے جا رہے ہیں۔

یہی تو اللہ کا ڈر ہے جو بندۂ مؤمن کے قلب کے اندر ہمیشہ جا گزیں ہونا چاہیے، جو اس کو صحیح سمت اور صحیح راستہ بتائے گا۔

ایک پتھر کا خوفِ خدا میں رونا

بھائیو! آج ہمارے دلوں کے اندر سے اللہ کا خوف نکل گیا، حالاں کہ یہ خوف وہ چیز ہے کہ اللہ کی وہ مخلوق جس کو ہم بے جان سمجھتے ہیں اس کو بھی حاصل ہے۔ امام غزالی رَحِمَہُ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام ایک دفعہ جا رہے تھے اور ان کو جانا تھا کوہِ طور پر اللہ سے ملاقات کے لیے، وہ کلیم اللہ تھے، اللہ سے گفتگو ہوتی تھی، اللہ سے ملاقات ہوتی تھی، جاتے جاتے راستے میں ایک جگہ ان کو نظر آیا کہ ایک پتھر بہت زور سے رو رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پتھر کس طرح رو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس کو ہم بے جان اور بے شعور مخلوق سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں

نہ بے جان ہے اور نہ بے شعور؛ بل کہ یہ سب چیزیں جاندار ہیں۔

عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک لکڑی کا رونا

خود ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ ''بخاری شریف'' میں موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک منبر لکڑی کا تھا، جو ویسا ہی معمولی سا بنا ہوا تھا، کوئی مستقل منبر نہ تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس پر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، کچھ لوگوں کو توجہ ہوئی، تو انھوں نے مسجد کے اندر مستقل ایک منبر تعمیر کر کے وہاں نصب کر دیا اور لکڑی کا عارضی منبر جو وہاں پر موجود تھا، اس کو وہاں سے ہٹا دیا، اس کے بعد حسبِ معمول اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ میں خطبہ ارشاد فرمانے تشریف لائے اور منبر پر کھڑے ہوئے، تو دیکھا کہ کسی کے بلک بلک کر رونے کی آواز آ رہی ہے، سب پریشان کہ یہ کون رو رہا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم ادھر ادھر پریشان ہو کر دیکھنے لگے، پھر کسی نے بتایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر، وہ منبر رو رہا ہے جس کے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اب تک کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ چھوڑ کر اس کی طرف تشریف لے گئے اور جا کر اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کیوں رو رہا ہے؟ منبر جواب دینے لگا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! اب تک آپ کی قربت مجھے نصیب تھی، نئے منبر کے بننے کے بعد مجھے ایک کونے میں ڈال دیا گیا، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سینے سے لگایا اور اس کو تسلی دی تو وہ خاموش ہو گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

'' وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم بِيَدِهٖ لَوْ لَمْ أَلْتَزِمْهُ مَازَالَ

بَاکِیاً حطباً حَتّٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ ، حزناً عَلٰی فِرَاقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم "

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر میں اس کو اپنے سینے سے نہ لگاتا، تو یہ میری جدائی کے صدمے میں قیامت تک روتا رہتا، اس کے بعد آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جاؤ! اس کو دفن کردو۔)

(الصحیح للبخاري:۳۳۱۹،سنن ابن ماجة:۱۴۰۷، سنن الدارمي:۴۱)

ہر چیز میں حیات وشعور ہے

بھائیو! ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی ذی روح ہیں، ہم ہی ذی شعور ہیں، خدا کی قسم! زمین بھی، آسمان بھی، چاندوسورج بھی، پتھر بھی، لکڑیاں بھی، پتے بھی اور یہ ذرّے بھی، ان سب کے اندر حیات و جان بھی ہے اور ہم سے زیادہ احساس بھی موجود ہے۔ مولانا رومی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا ہے:

خاک وبادوآب وآتش بندہ اند　　　با من وتو مردہ باحق زندہ اند

(مٹی وہوااور آگ و پانی ہمارے تمھارے لحاظ سے تو مردہ ہیں؛ لیکن اللہ کے لحاظ سے زندہ ہیں۔) چناں چہ قرآن میں ہے:

﴿مَا مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ.﴾

(اور کوئی چیز ایسی نہیں جو تعریف کے ساتھ اس (اللہ) کی پاکی نہ بیان کرتی ہو؛ لیکن تم لوگ ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں ہو۔)　　(الإسراء:۴۴)

اسی طرح ان سب میں شعور بھی ہے اور سب سے زیادہ بے حس و بے شعور تو انسان ہے، جس کو دعویٰ ہے عقل کا، جس کو دعویٰ ہے شعور کا، سب سے زیادہ بے عقل تو یہی ہے۔

غرض حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام گزر رہے تھے، ان کو آواز آئی پتھر سے رونے کی، تو اس سے پوچھا کہ تو کیوں رو رہا ہے؟ پتھر کہنے لگا کہ مجھے اللہ کا ڈر ہے کہ کہیں قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھے بھی جہنم میں نہ ڈال دیں، میں کہتا ہوں کہ اس پتھر کو یہ خدشہ اس لیے ہوا ہوگا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔) (التحریم: ٦)

لہٰذا اس نے کہا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی جہنم میں ڈال دیں، اگر میں بھی ان جہنمی پتھروں میں رہا، تو میرا حشر بھی برا ہوگا، اس بات کو یاد کرکے میں رو رہا ہوں اور کہنے لگا کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں اور کوہِ طور پر اللہ سے ملاقات و مناجات کے لیے جا رہے ہیں، آپ میرے حق میں سفارش کر دیجیے۔

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں اس وقت اللہ کے دربار میں جا رہا ہوں، اللہ سے دعا کرکے تیری بخشش کرا دوں گا، حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کوہِ طور پر پہنچے، اللہ سے باتیں کرنے لگے، ان باتوں کے درمیان حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام اس پتھر کو بھول گئے، اب دیکھیے! اللہ کی رحمت اور اس پر قربان جایے کہ جب واپس ہونے لگے، تو اللہ نے کہا کہ موسیٰ! تم اس پتھر کو بھول گئے؟ کیا تم نے اس سے سفارش کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے عرض کیا کہ اے اللہ! واقعی میں بھول گیا، آپ سب کچھ جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جاؤ! اس سے کہہ دو کہ ہم نے اس کی مغفرت کر دی اور اس کو بخش دیا اور دیگر پتھروں کے ساتھ اس کو جہنم میں داخل نہیں کروں گا، حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام خوشی خوشی واپس آئے، اس کو خوشخبری سنا دی اور چلے گئے، پھر کچھ دنوں کے بعد حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو کوہِ طور پر جانا تھا، اسی راستے سے جا رہے تھے، دیکھا کہ وہ پتھر پھر بھی رو رہا ہے، کہنے لگے کہ میں نے تو تجھ کو خوشخبری سنا دی تھی اور اللہ کا پیغام بتایا تھا

کہ اللہ تجھ کو جہنم میں داخل نہیں کرے گا، پھر اب رونے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ اے موسیٰ! اُس وقت اللہ کے خوف وڈر کی وجہ سے رو رہا تھا اور اب اللہ کی محبت میں رو رہا ہوں کہ جس خدا نے مجھے ایسی نعمت عطا کی، کیا اس کی محبت میں مجھے نہیں رونا نہیں چاہیے؟ (مكاشفة القلوب للغزالي)

اللہ اکبر! ہم کتنی نعمتیں کھاتے ہیں؟! لیکن کیا اللہ کی محبت دلوں میں سمائی ہے؟ اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کا کوئی جذبہ پیدا ہوا؟ جانور اللہ سے ڈریں اور پتھر میں اللہ کا خوف ہو؛ لیکن انسان بے خوف ہو کر زندگی گذاریں؟ کس قدر تعجب ہے؟

قرآن سے دلیل

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پتھر کے رونے کی یہ بات کیا صحیح ہے؟ اور اس کی کوئی دلیل ہے؟ تو میں عرض کروں گا کہ ہاں اس کی دلیل قرآن میں ملتی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ، وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ، وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ. ﴾ (البقرة:۷۴)

(اور بے شک پتھروں میں ایسے بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے اور بعض وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں۔)

حضرت مجاہد رَحِمَہُ اللّٰہُ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو بھی پتھر ایسے ہوتے ہیں، جن سے پانی نکلتا ہے یا وہ اوپر سے لڑھک کر گر جاتے ہیں، یا جن سے نہریں اور چشمے اُبلتے ہیں، وہ دراصل اللہ کے خوف کا نتیجہ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ پتھر کا خوف کھانا اور اس کی وجہ سے رونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

خوفِ خدا سے رونے کی فضیلت

حضرات! اللہ کے ڈر سے رونے کی بڑی فضیلت ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم ایک موقع پر ﴿سُوْرَةُ النَّجْم﴾ تلاوت کررہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے:

﴿أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۝ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ﴾

(النجم :۵۹-۶۰)

(اللہ تعالیٰ نے کافروں سے کہا کہ تم اللہ کے اس کلام سے انکار کرتے ہوئے تعجب کرتے ہو کہ کیسے نازل ہوگیا؟! اور اللہ کے کلام کا مذاق اڑاتے ہو، اور روتے نہیں ہو؟!)

جب اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے یہ آیتیں پڑھیں، تو صحابۂ کرام رَضِيَ اللهُ عَنْهُم کو رونا آگیا، پھر اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو بھی رونا آگیا، اس کے بعد آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ خوشخبری سن لو! جو آنکھ اللہ کے خوف اور ڈر کی وجہ سے روئے، وہ آنکھ جہنم میں داخل نہ ہوگی۔ (الدر المنثور:۷/۶۶۷)

یاد رکھو کہ جن آنکھوں سے اللہ کے ڈر کی وجہ سے آنسوں نکلتے ہیں، چاہے وہ مچھر کے پر کے برابر ہوں، مکھی کے پر کے برابر ہوں، اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں کہ جن پر اللہ نے جہنم کو حرام کردیا ہے؛ بل کہ جہنم کی آگ چھو بھی نہیں سکتی۔

"عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ، وَعَيْنٌ تَحْرُسُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"

(الجامع للترمذي:۱۶۳۹)

(ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر وخوف سے روتی رہتی ہے اور ایک وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں جاگتی رہتی ہے اور مسلمانوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔)

یعنی کچھ لوگ جہاد میں نکلے ہیں اور کچھ لوگ اللہ کے راستے میں نکلے ہیں، کچھ لوگ دینی خدمت میں لگے ہیں، ان سب کی حفاظت کرنے کے لیے ایک آنکھ جو سوتی نہیں، جاگتی رہتی ہے، تاکہ ان کی حفاظت ہو سکے، ان کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے، اس آنکھ پر بھی اللہ جہنم کو حرام کر دیتے ہیں۔

دنیا میں رونا سیکھو

بھائیو! قیامت کے دن کے رونے سے بچنے کے لیے، اس دنیا میں کچھ ندامت کے آنسو بہالو، رات میں اٹھ کر رویا کرو، اپنے گناہوں کو یاد کر کر کے رویا کرو اور اس سے مانگا کرو کہ اے اللہ! میں گنہ گار بندہ ہوں، مجھے معاف فرما! جب یہاں روئے گا، وہاں اس کی آنکھ محفوظ ہوگی، یہاں سوتا پڑا رہا، عیش کرتا رہا، اللہ اس کو کبھی یاد نہیں آیا، گناہوں کی گندگی میں زندگی کو ملوث کرتا رہا، ایک آنسو اللہ کے لیے کبھی نہیں بہایا، یوں ہی اس کی زندگی ہوگئی، قیامت کے میدان میں جا کر "کُلُّ عَیْنٍ بَاکِیَۃٌ" (ہر آنکھ روتی رہے گی) اس کو بھی روتے رہنا ہوگا اور یاد رکھو! یہاں کا رونا ختم ہو جائے گا، قیامت کا رونا کبھی ختم نہ ہوگا، جیسے جہنم کبھی ختم نہ ہوگی، وہاں کی تکلیفیں بھی ختم نہ ہوں گی: اس لیے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، دنیا میں کچھ رولیا کرو، کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل سے غور کر لیا کرو اور ساتھ ساتھ سوچو کہ ہم نے کیا کیا؟ گناہ کیے، اللہ کے سامنے کیا منھ لے کر ہم جائیں گے؟ پھر جو آنسو نکلے گا؟ وہ دل کو صاف کر دے گا، وہ دل کو پاک کر دے گا۔

اللہ کو رونا بہت پسند ہے-ایک واقعہ

فرمایا: ایک بزرگ تھے، جو بہت مقروض تھے، جب قرض خواہوں کا مطالبہ زیادہ ہونے لگا، تو ایک دن تمام قرض خواہوں کو بلایا کہ فلاں دن آجانا، قرض

ادا کر دوں گا، تو سب جمع ہو گئے ،انتظار کرتے رہے؛مگر ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں، کیا دیتے؟!لوگوں سے کہہ دیا کہ بیٹھ جاؤ، اللہ دے گا تو دیدوں گا۔

لوگ ٹھان کر آئے تھے کہ آج تو لے کر ہی جانا ہے،اس سے پہلے ٹلنا نہیں ہے؛ لہٰذا سب انتظار میں بیٹھ گئے، کچھ دیر بعد ایک بچہ مٹھائی بیچتا ہوا وہاں سے گزرا،تو ان بزرگ نے اپنے خادم سے کہا کہ دیکھو کیا آواز ہے؟ خادم نے بتایا کہ ایک لڑکا مٹھائی، حلوا بیچ رہا ہے اور آواز لگاتا جارہا ہے،ان بزرگ نے کہا کہ بھائی ! اس کو بلاؤ اور ان مہمانوں کو حلوا لے کر کھلاؤ، چناں چہ اسے بلایا اور ساری مٹھائی خرید کر سب کو کھلا دی، جب سب لوگ کھا چکے تو اس بچے نے مٹھائی کی رقم مانگی، وہ بزرگ کہنے لگے کہ اگر پیسے ہوتے تو یہ سب کیوں بیٹھے ہوتے؟ تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا، جب اللہ دیں گے تو دے دوں گا،اس پر وہ خوب رونے لگا اور چیخ چیخ کر رونے لگا، پوچھا کہ کیوں روتا ہے؟ کہا کہ میری ماں مارے گی، اگر میں اس مٹھائی کی رقم نہ لے جاؤں،اسی درمیاں میں کچھ دیر بعد اللہ نے رقم کا انتظام فرما دیا،ایک صاحب نے ان بزرگ کے دروازے پر دستک دی اور ایک تھیلی میں اشرفیاں لاکر حضرت کی خدمت میں پیش کر دیں، بزرگ نے خادم کو گننے کا حکم دیا کہ دیکھیں کتنی ہیں؟ جب گنی گئیں تو وہ اشرفیاں اتنی تھیں کہ قرض خواہوں کے قرض اور مٹھائی کی قیمت کے لیے کافی ہو گئیں اور اس سے قرض بھی ادا کر دیا گیا اور اس مٹھائی والے بچے کو اس کی قیمت بھی دے دی گئی،سب چلے گئے،اس کے بعد یہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے کہ اے اللہ! تو نے انتظام تو کر دیا؛مگر رسوا کر کے دیا، جلدی نہیں دیا،اس کی کیا حکمت ہے؟ اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ ہماری طرف سے تاخیر اس لیے ہوئی کہ یہاں مانگنے والے تو سب تھے؛مگر ان میں کوئی رونے والا نہیں تھا، جب ایک بچہ رونے والا آ گیا تو میں نے دے دیا۔

معلوم ہوا کہ اللہ کو رونا بہت پسند ہے؛ اس لیے اس کی جنابِ عالی میں رونے اور گریہ وزاری کی عادت ڈالنا چاہیے۔

آنکھ کو حرام لذت سے بچاؤ

بعض روایات میں ہے: "کُلُّ عَیْنٍ بَاکِیَۃٌ" ہر آنکھ قیامت کے دن روتی رہے گی، سب پریشان حال خوف کے مارے روتے ہوں گے؛ لیکن تین آنکھیں اس دن رونے سے محفوظ رہیں گی، ایک وہ جو اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے روتی ہو، دوسری وہ جو اللہ کے راستے کی حفاظت کی خاطر جاگنے والی ہو، وہ قیامت میں محفوظ رہے گی، تیسرے "عَیْنٌ کَفَّتْ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ" (وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے) یہ وہ آنکھیں ہیں کہ قیامت کے دن سب آنکھیں دہشت ووحشت کے مارے روتی ہوں گی؛ مگر یہ تین قسم کی آنکھیں خوشی کے آنسوں بہائیں گی

اس حدیث میں جو تیسری آنکھ کا ذکر ہے، اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ کیا؟ اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کرنے والی آنکھ، وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے رک جائے، وہ آنکھ یہ سوچتی ہے کہ میں ایک غیر محرم کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ ایک لڑکی کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ اس پوسٹر کو دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ انٹرنیٹ کے اندر ہزاروں خرافات ہوتے ہیں، اس کو میں دیکھ سکتی ہوں یا نہیں؟ اور اگر یہ دیکھنے کے لائق نہیں ہیں، تو وہ اللہ کے ڈر اور خوف سے اس کو لات مار دیتی ہے، ایسا آدمی اپنی آنکھ کو بند کر لیتا ہے، اگرچہ دل اندر سے مجبور کرتا ہے؛ لیکن وہ کہتا ہے کہ جس سے میرا خدا ناراض ہو، میں وہاں آنکھ نہیں اٹھاتا، میں یہاں اندھا بن جاؤں گا، ایسی کوئی چیز نہیں دیکھوں گا اور حرام لذات کو اختیار نہیں کروں گا، میں کہتا ہوں کہ آج کے دور کا بڑا گناہ اور عام گناہ بد نظری کا گناہ ہے۔ یہ بہت سارے

گناہوں کا ذریعہ بنتا ہے، وہ مؤمن کامیاب ہے، جو چلتا ہے، گھومتا ہے؛ مگر اس کی آنکھیں اور دل کسی سے ٹکراتے نہیں۔ جیسے کوئی کار ڈرائیور باوجود یہ کہ راستے میں بہت ساری گاڑیاں چلتی ہیں، پھر بھی بچتے بچاتے چلاتا ہے، یہ کامیاب ڈرائیور ہے۔

حضرت مرشدی مولانا ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ ''بنگلور'' تشریف لائے اور ''جامعہ مسیح العلوم، بیدواڑی'' میں حضرت والا رحمہ اللہ کی مجالس بعد عصر ہوا کرتی تھیں، ایک دن بیان کے بعد کار میں بیٹھ کر قیام گاہ روانہ ہوئے اور میں بھی کار میں بیٹھا تھا اور راستوں پر خوب ٹرافک تھی اور حضرت رحمہ اللہ کے ڈرائیور، کار کو کبھی ادھر کبھی اُدھر گھماتے؛ تا کہ اور گاڑیوں سے ٹکرا نہ جائے، اس کو دیکھ کر حضرت رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا: دیکھو! تقوی اسی کو کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ہر خطرے سے بچاتے ہوئے چلے۔ جیسے ڈرائیور صاحب کار کو خطرات سے بچاتے ہوئے چلا رہے ہیں، پھر فرمایا کہ وہی ڈرائیور کامیاب ہے، جو کسی کو ٹکر نہ لگائے اور خود بھی کسی کی ٹکر نہ کھائے، اسی طرح جو نگاہ اس دنیا میں شریعت کے راستے پر اس طرح چلے کہ کسی ناجائز چیز سے ٹکر نہ لے اور گناہ کا ارتکاب نہ کرے وہ کامیاب ہے۔

بھائیو! یہ بڑی عمدہ مثال ہے، اس کو ذہن نشین کرلو اور سمجھو کہ جس نے اپنی نگاہوں کی حفاظت کرلی، وہ کامیاب ہے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''النَّظْرُ سَهْمٌ مِّنْ سِهَامِ إِبْلِيْسَ مَسْمُوْمَة.''

(نظر شیطان کا زہریلا تیر ہے۔)

(المستدرک للحاکم: ۴/۳۴۹)

جو نظر کی حفاظت کرتا ہے، تو عبادت میں حلاوت آتی ہے، ''الأدب المفرد''

میں امام بخاری رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ فضول نظر سے بھی بچنا چاہیے، میں کہتا ہوں: جب فضول نظر سے بھی بچنا چاہیے، تو نظر بد سے بچنا بہ درجۂ اولی ضروری ہے۔

نوجوانو! اگر تم کو قیامت میں ہنسنا ہے اور رونا نہیں ہے، تو اپنی آنکھوں کو حرام لذتوں سے بچاؤ اور اس سے اندھے بن جاؤ۔

سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو عبرت انگیز ہے اور یہ واقعہ میں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ سے ایک وعظ میں سنا ہے اور یہ واقعہ ہے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ کا ، حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ ہندوستان کے ایک مشہور بزرگ اور بڑے اللہ والے تھے اور انھوں نے ہندوستان کے اندر حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے فتوے پر جہاد کی مہم کا آغاز کیا تھا، انھی جہادی مہموں کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر یہ ملک آزاد ہوا اور اگر چہ بہ ظاہر یہ تحریکات ناکام ہوئیں، ؛مگر درحقیقت بعد کی تمام تحریکات کے لیے یہی تحریکات پیش خیمہ تھیں، انگریزوں کے یہاں سے بھاگنے کا ذریعہ ان ہی علمائے کرام کا طفیل ہے، بعض جاہل کہتے ہیں کہ صوفیا نے جہاد نہیں کیا، حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ مایۂ ناز صوفی ہونے کے ساتھ مایۂ ناز مجاہد بھی تھے، انھوں نے سب سے پہلے آزادی کی جنگ لڑی ہے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے فرمان پر وہ کئی جہاد کی مہموں پر گئے ؛بل کہ وہی سپہ سالار بھی تھے اور اسی میں ان کی شہادت واقع ہوئی، بعض جاہلوں نے صوفیائے کرام کے بارے میں یہ بات پھیلا رکھی ہے کہ صوفیا صرف تسبیح گھونٹتے رہتے ہیں، دیکھو! اگر تمھاری آنکھ ہو اور اگر تمھارے پاس دل ودماغ صحیح موجود ہو، تو صوفیائے کرام کے کارناموں کو دیکھو اور یہ کتنا بڑا صوفی ہے، جن کا نام سید احمد شہید

بریلوی رَحِمَہُ اللہُ ہے، جوسب سے پہلے جہاد کی مہم کا آغاز کرنے والا تھا۔

الغرض سید احمد شہید رَحِمَہُ اللہُ ایک جہاد کی مہم پر گئے، پنجاب کا علاقہ تھا، وہاں پر پنجابی عورتیں باہر آتی جاتی تھیں، گھومنے اور پھرنے آتی تھیں، بازاروں میں بھی آتی جاتی تھیں، ایسے علاقے میں حضرت کا اور تمام مجاہدین کا قیام تھا، ایک دن ایک پنجابی آدمی حضرت رَحِمَہُ اللہُ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولانا! میں ایک بات پوچھنے آیا ہوں کہ آپ ان اندھوں کو لے کر یہاں کیوں آئے ہیں؟ اور کیا بستی کے لوگوں میں آپ کو کوئی صحت مند لوگ نہیں ملے کہ آپ اندھوں کو لے کر آ گئے؟ آپ تو کچھ دیکھتے ہوئے نظر آتے ہیں؛ مگر اتنے سارے یہ اندھے جو کچھ دیکھتے ہی نہیں، ان کا کیا کام ہے؟ حضرت رَحِمَہُ اللہُ نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی اندھا نہیں ہے، سب آنکھ والے ہیں، اچھی طرح دیکھتے ہیں، پھر پوچھا کہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب اندھے ہیں؟ اس نے کہا: میں ان سب کو اندھا؛ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری عورتیں یہاں آتی جاتی ہیں، بازاروں میں بھی گھومتی پھرتی ہیں، حسین وجمیل ہیں؛ لیکن آپ کے ساتھیوں میں کا کوئی ایک آدمی بھی کسی عورت پر نگاہ نہیں ڈالتا، ان کو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اس سے میں نے سمجھا کہ یہ سب اندھے ہوں گے، حسن وجمال کا کیا نظارہ کریں گے، حضرت سید احمد شہید رَحِمَہُ اللہُ نے فرمایا کہ بھائی! تم نے صحیح دیکھا؛ اس لیے کہ ہمارا کوئی آدمی کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا؛ اس لیے کہ ہمارے قران کا حکم ہے:

﴿ قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ ﴾

(النور: ۳۰)

(اے نبی! آپ مؤمنوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھا کریں۔)

یہ عفت اور پاکدامنی کا تقاضا ہے، ہمارے یہ مجاہدین کسی عورت پر نگاہ نہیں

ڈالتے ، وہ شخص کہنے لگا کہ میں نے تو ان کو اندھا سمجھ لیا تھا ، دراصل میں ہی اندھا تھا اور آج آپ نے مجھے بینا بنادیا۔

حضرات ! جو قرآن نہ پڑھتا ہو ، وہ سب سے بڑا اندھا ہے ، جو حدیث نہ پڑھتا ہو ، وہ سب سے بڑا اندھا ہے ، یہ اندھے نہیں ہیں ، جو نیچے دیکھ رہے ہیں ، وہ تو اللہ کے حکم کو دیکھ رہے ہیں۔

غرض یہ کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ تین قسم کی آنکھ قیامت کے دن رونے سے محفوظ رہے گی : اللہ کے ڈر سے رونے والی آنکھ اور اللہ کے راستے میں جاگنے والی آنکھ اور تیسرے " کَفَّتْ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ " وہ آنکھ جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

اصل حسن یہ ہے - ایک واقعہ

ایک مرید خانقاہ میں تھا ، اسے کھانا پہنچانے ایک لڑکی مقرر کی گئی تھی ، جب جب بھی وہ لڑکی کھانا دینے کے لیے آتی ، تو وہ مرید اس لڑکی پر نظر بد ڈالتا تھا اور اس کو گھور گھور کر دیکھنے لگتا ، شیخ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس لڑکی کو دست آور گولیاں دیں ، جس کی وجہ سے اس کو دست شروع ہو گئے اور شیخ نے اس کی غلاظت ایک جگہ کسی چیز میں جمع کرنے کا حکم دیا ، ان کے خدام اس کی غلاظت کو جمع کرتے رہے ، دستوں کی وجہ سے وہ لڑکی نہایت ضعیف ونحیف ہو گئی ، اس کی طبیعت نڈھال ہو گئی ، چہرہ پھیکا پڑ گیا اور مرجھا گیا ، اب شیخ نے اس لڑکی کو اس مرید کے سامنے بلایا ؛ مگر اب وہ مرید اسے دیکھتا ہی نہیں ، اس کی طرف کوئی التفات ہی نہیں ، شیخ نے اپنے خدام سے فرمایا کہ وہ جمع شدہ غلاظت اُٹھا کر لاؤ ، جب وہ لائی گئی تو شیخ نے اس مرید سے کہا کہ تم در حقیقت اس لڑکی پر اور اس کے حسن پر فریفتہ نہیں تھے ؛ بل کہ اس کے اندر کی غلاظت

پرفریفتہ تھے؛ اس لیے جب تک یہ غلاظت اس کے اندر تھی، تم اس کو گھور گھور کر دیکھتے رہے اور جب وہ باہر نکل گئی تو اب دیکھنے کو تیار نہیں ہو۔

واقعی عجیب طرح دنیا کی مادی وفانی محبتوں کا علاج کیا ہے، اگر یہ نسخہ یاد ہو گیا تو پھر کبھی بھی انسان دنیا کی ان فانی محبتوں کے پیچھے نہیں جائے گا۔

ایک حیرت ناک واقعہ

بزرگانِ محترم! یہ آنکھوں کے آنسوں بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی آنکھ پر جہنم حرام ہو جاتی ہے اور اس کے آنسوں جہنم کی آگ کو بھی بجھا دیتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رَحِمَہُ اللہُ کے زمانے میں ایک عجیب قصہ پیش آیا، وہ یہ کہ لکھنؤ کا رہنے والا ایک آدمی تھا، کام دھام نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا، ایک دفعہ اسے کسی نے مشورہ دیا کہ تو کسی اور شہر اور علاقے میں چلا جا، ہوسکتا ہے کہ وہاں کچھ کام لگ جائے، وہ آدمی ایک سواری پر سوار ہو کر دوسری بستی کے لیے نکلا، راستے میں ایک بستی پر سے گزر ہوا اور بھوک تیز لگ رہی تھی، وہاں اُترا اور کچھ کھایا پیا اور آگے بڑھ گیا، ایک دوسرے مقام پر جانا تھا، وہاں گیا اور خوب کمایا، اس کی لڑکی کی شادی طے ہو گئی، اس نے کہا: اب شادی کرنے جانا ہے، روپۓ پیسے جمع کر کے تھیلی باندھ کر، سوار ہو کر، پھر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ پر کھانے پینے کی ضرورت پڑ گئی، وہاں پر اُترا، تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں پر ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے؛ اس لیے جنازے میں شریک ہو جاؤ، تو وہ شخص جنازے میں شریک ہو گیا اور وہ خود تدفین میں شریک رہا، فراغت کے بعد جب وہاں سے نکلنا چاہا، تو دیکھتا ہے کہ پیسوں کی تھیلی غائب، جس میں ہزاروں روپۓ موجود تھے اور وہ اسی رقم سے

اپنی بچی کی شادی کرنا چاہتا تھا، وہ سوچنے لگا کہ پیسے غائب ہو گئے ہیں، تو اپنے گاؤں جا کر کیا کروں گا، لوگ تھوتھو کریں گے، برا بھلا کہیں گے، اتنے سال غائب رہا، اب بچی کی شادی کا نمبر آیا، اب بھی کچھ لے کر نہیں آیا، گھر والوں کو کیا جواب دوں گا؟ پریشان ہو کر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے کہا میری تھیلی غائب ہو گئی ہے، پوچھا کیسے غائب ہوئی؟ اس نے کہا میں یہاں آیا ہوا تھا اور اس آدمی کی تدفین میں شریک رہا، جب باہر آ کر دیکھتا ہوں تو یہ حال اور نوبت کہ پیسے غائب ہیں، اس نے کہا: ہو سکتا ہے کہ کہیں قبر میں گر گئے ہوں، ذرا قبر کھود کر دیکھ لو! اس نے کہا: ٹھیک ہے، اب یہ آدمی قبر کھودنے لگا، ابھی ذرا سی کھودا تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے آگ کی لپیٹیں آ رہی ہیں اور اس کی وجہ سے اس کے ہاتھ بھی جل گئے اور وہ چیخیں مارتا ہوا بھاگا اور قبر سے باہر آیا اور جو باہر آیا، تو دیکھا کہ سب کچھ بدلا ہوا ہے، پورا ماحول بدلا ہوا ہے، نہ وہاں بازار ہے، نہ ویسی دکانیں ہیں، لوگ جیسے پہلے وہاں پہچان کے تھے، ویسا کوئی آدمی وہاں پر نظر نہیں آتا، بڑا عظیم الشان شہر وہاں پر آباد ہو گیا ہے، جب کہ اتنا بڑا وہاں کوئی شہر نہیں تھا، پہلے وہاں ایک گاؤں قریے کی طرح تھا اور چند دکانیں تھی، اب وہ گاؤں کہاں گیا؟ وہ پرانی آبادی کہاں گئی؟ یہاں تو پورا ماحول بدلا ہوا ہے، لوگوں سے اپنے وطن کے بارے میں پوچھا کہ فلاں نام کی بستی کو جانتے ہو، لوگ کہنے لگے: وہ بستی اس وقت دنیا میں نہیں ہے، ہم سنتے تھے کہ کوئی بہت پرانی بستی تھی؛ لیکن اب نہیں ہے، یہ آدمی کہنے لگا: یہ تبدیلی کیسے ہو گئی؟ ابھی دس پانچ منٹ پہلے کی تو بات ہے کہ میں یہاں تھا اور جانے کے لیے نکلا تھا، لوگوں نے کہا: تم بے وقوف آدمی ہو، تھوڑی دیر کی بات کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم اپنے باپ دادا سے سنا کرتے تھے کہ کسی زمانے میں اس نام کی بستی تھی، لوگوں نے کہا کہ اب وہ بستی تو ہے نہیں، خیر اس نے کھانے کے لیے جو اپنے پاس تھوڑی بہت رقم تھی

وہ نکال کر دکان میں دی کہ اس سے سالن روٹی دے دو، دکان دار نے کہا بھائی! یہ پیسہ آپ کونسے زمانے کا اُٹھا کر لائے ہیں، یہ تو تین چار سو سال پہلے کے معلوم ہوتے ہیں، اس نے کہا کہ تین چار سو سال کے کیسے ہوگئے؟ ابھی کچھ ہی دیر کی تو بات ہے، دکان دار نے کہا کہ اب یہ پیسے چلنے کے نہیں، حکومتیں بدل گئی ہیں اور سب کچھ بدل گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ حال، دوسری طرف قبر کی آگ کی تپش کی وجہ سے ہاتھ میں جلن اور درد و تکلیف محسوس ہو رہی تھی، جو وہاں پر ڈاکٹر وغیرہ تھے، ان سے اس کا علاج کرایا؛ لیکن تکلیف بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اس کو مشورہ دیا کہ اس زمانے میں تمھاری بستی نہیں ہے اور یہ کہ تم وہاں جاؤ تو کوئی فائدہ نہیں؛ اس لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں بہت بڑے عالم و محدث ہیں، جن کا نام حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ہے، ان کی خدمت میں چلے جاؤ، ان کی خدمت میں تمھارا پورا واقعہ سناؤ، ہوسکتا ہے کہ وہ تم کو کوئی مشورہ دیں، لوگوں نے اس کو کچھ رقم دی اور اس کو دہلی کا راستہ بتا دیا، اب وہ دہلی پہنچ کر سیدھے حضرت شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ زمانہ حضرت شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا بہت ہی عروج کا زمانہ تھا، ان کی عظمت کا سکہ سارے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا، ہر جگہ ان کو جاننے والے لوگ تھے اور ان کی فن حدیث میں بصیرت و مہارت ساری دنیا میں مشہور تھی، وہ شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ سے ملا اور کہا کہ میرے ساتھ ایسا ایک واقعہ پیش آیا اور میری تکلیف انتہائی شدید ہوگئی ہے، مجھے اس کا علاج بھی بتائیے اور یہ راز بھی بتائیے کہ یہ میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا؟ شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کی گفتگو پوری تفصیل کے ساتھ سنی، پھر کہا کہ تمھاری بات سچی ہے؛ اس لیے کہ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ آخرت اور دنیا کے زمانے میں بڑا فرق ہے کہ وہاں ذرا سی دیر تم جا کے آئے اور یہاں

سالہاسال گذر گئے، چناں چہ حدیث میں اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو نیک بندہ قبر میں چلا جاتا ہے، اسے قیامت تک کا زمانہ صرف اتنا معلوم ہوگا، جیسے ظہر سے عصر تک کا زمانہ: ظہر سے عصر تک کا زمانہ دو تین گھنٹے کا ہوتا ہے، قبر میں جانے کے بعد نیک آدمی جب قیامت میں اٹھے گا تو وہ کہے گا کہ الحمدللہ! میں ظہر میں سویا تھا، عصر میں اٹھ رہا ہوں؛ مگر یہاں دنیا میں نہ معلوم کتنی صدیاں گزر جائیں گی؟

یہ راز اللہ والے جانتے ہیں، دنیا والے نہیں جانتے، یہ وہ علوم ہیں جو صرف انبیاء کے ذریعے آتے ہیں، کوئی سائنس دان نہیں بتا سکتا، سائنس دانوں کا علم اور ان کی عقل اس دنیا کی سطح پر گھومتی ہے اور یہ علوم دینے والے حضرات انبیاء ہوتے ہیں، یا ان کی وراثت پانے والے علمائے کرام ہوتے ہیں۔

بہ ہر حال شاہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ تمھاری بات سچی ہے، تم چوں کہ قبر میں اُترے تھے، جو تم نے دیکھا تھا، وہ قبر اور دوسرے عالم سے تعلق رکھنے والی چیز تھی، جو ذرا سا لمحہ وہاں گزر گیا، تو یہاں زمانہ بدل گیا، حکومتیں بدل گئیں، خاندان تباہ ہوگئے اور معلوم نہیں کہ تمھارے خاندان کا کیا حال ہوا ہوگا؟ اب رہا یہ کہ تمھارا ہاتھ جل گیا، یہ دنیا کی آگ سے نہیں جلا ہے؛ بل کہ یہ دوزخ کی آگ سے جلا ہے، قبر کی آگ دوزخ کی آگ ہے، دنیا کی آگ نہیں ہے، اگر دنیا کی آگ ہوتی تو ڈاکٹر کا علاج کافی ہوسکتا تھا، جہنم کی آگ کے لیے ڈاکٹر کا علاج کافی نہیں، دنیا کی آگ سے جل جائے تو ڈاکٹروں سے علاج کراتے ہیں؛ مگر یہ تو جہنم کی آگ ہے جس کا کوئی ڈاکٹر علاج نہیں کرسکتا، اس کا ایک ہی ایک علاج میرے ذہن میں ہے اور وہ یہ کہ تم جاؤ کسی مسجد کے کونے میں بیٹھو اور اپنے گناہوں کو یاد کر کے رویا کرو اور جو آنسوں نکلیں، اس کو تکلیف کی جگہ پر لگایا کرو، یہی ایک چیز دوزخ کی آگ کو بجھا

دینے والی ہے یعنی اپنے گناہوں پر یاد کر کے رونا، اللہ کے ڈر سے رونا۔

فرمایا: جو آدمی اللہ کے ڈر سے اپنے گناہوں کو یاد کر کے روتا ہے، دوزخ کی آگ کو اس سے بجھایا جا سکتا ہے؛ اس لیے اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ تم یاد کرو اپنے گناہوں کو اور روتے رہا کرو۔

بھائیو! یہ واقعہ بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے، ہمارے لیے عبرت کا سامان ہے، اللہ کے سامنے روؤ اور گڑگڑاؤ، جو آنکھ روتی ہے، جہنم اس پر حرام ہے، جو آنکھ کہ اپنے گناہوں پر اللہ کے خوف میں روتی ہے، وہ ضرور جنت میں داخل ہوگی اور جب خود جنت میں جائے گی تو پورے جسم کو لے کر جائے گی، تنہا آنکھ تو جانے کی نہیں۔

کبھی کبھی قبر کے احوال کھل جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ اس دنیا کے اندر برزخ کے حالات کو ظاہر کر دیتا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں کیا ہوتا ہے؟ اور بعض جاہل کہتے ہیں کہ ہم نے بعض قبروں کو کھود کر دیکھا؛ مگر کچھ نہ نکلا ؛ لیکن بھائیو! جب اللہ دکھانا چاہتا ہے، تب ہی ہم دیکھ سکتے ہیں، جب اللہ دکھانا نہیں چاہتا، آپ لاکھ کوشش کریں، نہیں دکھائی دے گا؛ کیوں کہ ان چیزوں کا دکھانا اور نہ دکھانا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ مگر ہم کو اللہ نہ دکھائے تو اس کا انکار کرنا درست نہیں؛ کیوں کہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ، جن سے زیادہ روئے زمین پر سچا کوئی نہیں اور نہ آئندہ کوئی ان سے زیادہ سچا انسان ہو سکتا ہے، انھوں نے ہم کو خبر دی کہ قبر میں حالات پیش آتے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی، عذاب قبر بھی ہوتا ہے، ثواب قبر بھی ہوتا ہے، اچھوں کے لیے اچھے معاملات ہوتے ہیں، بروں کے لیے برے معاملات ہوتے ہیں، جب نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جیسے سچے انسان نے سچی روایات میں، صحیح احادیث میں ہم کو بتا دیا ہے، تو اس پر یقین کرنا

ہمارا فرض ہے اور صرف اس بات پر ان باتوں کا جھٹلانا کہ ہم کو نظر نہیں آتا ہے، خلاف عقل ہے۔ آپ کیا کیا جھٹلائیں گے، اگر آپ کو نظر نہیں آتا ہے؟ خدا بھی تو نظر نہیں آتا، کیا خدا کو بھی جھٹلاؤ گے؟ جنت بھی تو نظر نہیں آتی، کیا جنت کا بھی انکار کرو گے؟ دوزخ بھی نظر نہیں آتی، کیا دوزخ کو بھی جھٹلاؤ گے؟ فرشتے بھی نظر نہیں آتے، کیا ان کا بھی انکار کرو گے؟ نہ معلوم کیا کیا چیزیں ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتی؟ لیکن ان سب کو ماننا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یا محمد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی احادیث صحیحہ اس سلسلے میں مروی ہیں، تو بہ ہر حال عذاب قبر ہوتا ہے۔

عذابِ قبر کا ثبوت

حدیث میں ہے کہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم گزر رہے تھے، دو قبریں تھی، آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ ان دو قبر والوں پر عذاب قبر ہو رہا ہے، ایک پر اس لیے کہ وہ پیشاب کے قطروں اور چھینٹوں سے حفاظت نہیں کرتا تھا اور دوسرے پر اس لیے کہ وہ چغلی کھایا کرتا تھا۔

(الصحيح للبخاري:۲۰۹،الصحيح للمسلم:۳۴۹)

آج لوگ کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتے ہیں، فیشن بن گیا ہے، حفاظت نہیں کرتے، پاکی صفائی کا اہتمام نہیں کرتے، اسلام کے اندر سب سے اہم پاکی اور صفائی ہے، نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"الطُّهُوْرُ شَطْرَ الْإِيْمَانِ"

(پاکی آدھا ایمان ہے۔)

(الصحيح للمسلم:۳۲۸،الجامع للترمذي:۹ ۳۴۳)

اور باقی آدھا ایمان دوسری چیزوں میں رکھا ہے، آپ پاک وصاف نہیں تو نماز نہیں پڑھ سکتے، آپ پاک وصاف نہیں تو خدا سے تعلق نہیں پیدا کر سکتے، اللہ سے تعلق کے لیے سب سے پہلے پاکی اور صفائی کی ضرورت ہے۔

کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو

بھائیو! کسی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو۔ حدیث میں ہے: " كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ "
(ہر نیکی صدقہ ہے۔) (الصحيح للبخاري:۵۵۶۲،الجامع للترمذي:۱۸۹۳)

اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ قید نہیں لگائی ہے کہ نیکی بڑی ہو تو صدقہ ہے، اونچی ہو تو صدقہ ہے، اس کی قید اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہیں لگائی؛ کیوں کہ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی نیکی بھی کام آجاتی ہے اور جنت کا ذریعہ بن جاتی ہے اور ایک حدیث میں ہے:

"لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَيْئاً،وَلَوْ أَنْ تَلْقٰى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيْقٍ"

فرمایا رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اور وہ بھی "نون تاکید" کے ساتھ کہ تم کسی بھی نیکی کو ہرگز حقیر نہ سمجھو، اگر چہ وہ یہی ہو کہ تم اپنے بھائی سے ہنس مکھ چہرے سے ملاقات کرو۔ (الصحيح للمسلم:۴۷۲۰،الجامع للترمذي:۱۷۵۶)

دیکھا کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کو بھی حقیر نہ جاننے کا حکم دے رہے ہیں کہ کسی اپنے بھائی سے خوش دلی سے مل لیا جائے؛ اس کی کیا وجہ ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ آدمی عموماً چھوٹی نیکیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور چھوٹی سمجھ کر اس کو ترک کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک نیکی کو چھوٹی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے، آگے چل کر وہ بڑی بڑی نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، واجبات میں کوتاہی ہو جاتی ہے، سنتوں کو ترک کر دیتا ہے، فرائض میں بے توجہی ہوتی ہے، ماں باپ کے حقوق

صحیح طرح سے ادا نہیں کرتا ہے، ان کی خدمت سے اعراض کرتا ہے، غرض یہ کہ وہ کئی بڑی بڑی عبادتوں اور نیکیوں سے غفلت برتنے لگتا ہے، اس کی نوبت اس لیے پیش آئی؛ کیوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو چھوڑتا چلا گیا، ان کو حقیر و ناقص سمجھ کر ان کو کمتر اور گھٹیا سمجھ کر، حال آں کہ بعض اوقات بڑی بڑی عبادتوں کو وہ درجہ نہیں ملتا، جو چھوٹی چھوٹی عبادتیں پالیتی ہیں؛ کیوں کہ چھوٹی عبادات میں اخلاص ہوتا ہے اور بڑی میں اخلاص نہیں ہوتا اور یہ بھی کیا معلوم کہ اللہ کو کب، کہاں، کونسی عبادت پسند آجائے؟ اور اس کی بنا پر اس کی مغفرت ہو جائے۔

تہجد کے دو رکعت ہی کام آئے

ایک مرتبہ کسی بزرگ نے اپنے خواب میں حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو دیکھا اور انھوں نے ان سے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ ہم نے تمھاری مغفرت کردی، پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ آپ کی بخشش کس بنیاد پر ہوئی؟ جنید بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا:

”طَاحَتْ تِلْکَ الْإِشَارَاتُ، وَغَابَتْ تِلْکَ الْعِبَارَاتُ ، وَفَنِیَتْ تِلْکَ الْعُلُوْمُ ، وَ نَفِدَتْ تِلْکَ الرُّسُوْمُ ، وَ مَا نَفَعَنَا إِلَّا رُکَیْعَاتٌ کُنَّا نَرْکَعُهَا فِي الْأَسْحَارِ.“ (صفوۃ الصفوۃ:۲/۴۲۴، حلیۃ الأولیاء:۱۰/۲۵۰)

(ساری کی ساری عبارتیں ختم ہوگئیں، وہ رموز و نکات ضائع ہو گئے، وہ علوم فنا کے گھاٹ اتر گئے، بس ہمارے حق میں سود مند ثابت ہوئیں تو وہ الٹی پلٹی، ٹیڑھی میڑھی، غلط سلط، دو رکعتیں ثابت ہویں جو ہم راتوں میں اُٹھ کر پڑھ لیتے تھے۔)

دیکھو! جنید بغدادی رحمۃ اللہ جنھوں نے احادیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، جنھوں نے قرآن وحدیث کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، نکات کو واضح کیا، جو"سید الاولیاء" کا لقب پانے والے بزرگ ہیں، جنھوں نے اللہ کی خاطر ساری دنیا سے بغض وعداوت مول لی، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردیا، جنھوں نے اللہ کی محبت کی طلب میں رات دن عبادتوں پر عبادتیں کیں، وہ بزرگ کہتے ہیں کہ نہ وہ فرائض وواجبات کام آئے، نہ وہ رموز واسرار کام آئے، نہ وہ تصوف وسلوک کے حقائق ومعارف کام آئے، کام آئے تو وہ دو رکعت نفل جو رات میں اٹھ کر پڑھے تھے، وہ کام آئے، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کبھی کبھی چھوٹی نیکی میں بھی جنت رکھ دیتا ہے، بندہ جب اس کو کرتا ہے، تو وہ اس جنت کو پالیتا ہے۔

عمل پر نہیں، رحمت پر بھروسہ ہو

آدمی صرف نیکیوں پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائے، اللہ کی رحمت سے اپنے آپ کو الگ کرلے اور سمجھے کہ مجھے اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کی کوئی ضرورت نہیں، یہ انتہائی نامعقول بات ہے، حدیث میں فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی بھی آدمی اپنی نیکیوں کے سبب جنت میں نہیں جائے گا؛ بل کہ اللہ کی رحمت سے ہی جنت میں جائے گا۔ (الصحیح للبخاري:۵۲۴۱،الصحیح للمسلم:۵۰۴۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس پر کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بھی؟ فرمایا کہ ہاں! میں بھی اللہ کی رحمت سے ہی جاوں گا۔

اس پر غور کرو کہ کتنی بڑی بات ہے!! خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں بھی اللہ کی رحمت سے جنت میں جاؤں گا، تو ہم اور آپ کس کھیت کی مولی

ہیں؟ ہم کیسے اپنے اعمال پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں کر سکتے، ہم ہر وقت، ہر آن، ہر گھڑی اللہ کے محتاج ہیں، اس کی رحمت کے بھکاری ہیں۔

ایک علمی نکتہ

یہاں ایک علمی نکتہ بھی سن لیجیے، وہ یہ کہ قرآن کی بعض آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں انسانوں کو عبادت و نیکیوں کی بنا پر بھیجتا ہے، مثلاً قرآن میں ہے: ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل: ۳۲)

(تم جنت میں داخل ہو جاؤ! بہ سبب ان اعمال کے جو تم کیا کرتے تھے۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہو رہا ہے اور یہ حدیث کہہ رہی ہے کہ کوئی بھی اپنی نیکیوں سے جنت میں نہیں جائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں: ایک عمل کا سببِ جنت ہونا اور دوسرے عمل کا عوضِ جنت ہونا۔ پہلی بات ثابت ہے اور دوسری بات منفی؛ لہٰذا قرآن میں جو یہ کہا کہ عمل کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ، اس میں عمل کو سببِ جنت کہا گیا ہے اور حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ عمل سے جنت نہیں ملتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل جنت کا عوض نہیں؛ لہٰذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے کہ ایک بادشاہ نے اعلان کیا کہ ہمارے خدام میں سے جو شخص فلاں کام انجام دے گا، ہم اس کو ایک لاکھ روپئے انعام دیں گے اور ایک وزیر نے وہ کام کر دیا اور بادشاہ نے اس کو وہ مجوزہ انعام دے دیا، اس مثال میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وزیر کو جو انعام ملا، وہ اس کے کام انجام دے دینے کے عوض میں ملا ہے؛ بل کہ یہ تو سراسر انعام ہے، عوض کہاں کا ہو گیا؟ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کو جو انعام ملا، وہ اس کام کو انجام دینے کے سبب سے ملا، اسی طرح جنت ہماری

نیکیوں کے عوض میں نہیں ملتی؛ بل کہ وہ تو اللہ کا انعام ہے، جو ہمارے اعمال کے سبب سے ہمیں ملتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک عابد کا واقعہ

حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عابد رہا کرتا تھا، جو بڑی بڑی عبادتیں کرتا تھا، بہت بڑا زاہد تھا، جو ہمیشہ اللہ کی یاد میں مصروف رہتا تھا، پانچ سو برس تک اس نے عبادت کی اور اللہ نے اس کے لیے ایک چشمہ پانی پینے کے لیے جاری فرمایا تھا اور روزانہ ایک انار کھانے کے لیے اس کو دیا جاتا تھا، جب اس کا انتقال ہوا اور اس کو اللہ کے دربار میں پیش کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جاؤ ہم اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرتے ہیں، اس پر اس نے کہا کہ یا اللہ! وہ جو میں نے پانچ سو برس عبادت کی تھی، وہ کیا ہوئی؟ اللہ نے دو فرشتوں سے کہا کہ میری نعمتوں کا اس کی عبادت سے حساب لگاؤ، فرشتوں نے حساب لگایا تو پانچ سو برس کی عبادت کے بدلے میں صرف ایک آنکھ کی نعمت آئی تو اللہ تعالی نے فرشتوں سے کہا کہ اس کو جہنم میں ڈال دو؛ اس لیے کہ اس کے پاس جنت میں جانے کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔

جب اس کو جہنم میں ڈال دیا گیا تو وہ اللہ کو پکار کر کہنے لگا کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے مجھے بخش دے۔ الغرض اس کو جہنم سے نکال کر لایا گیا اور اللہ نے اسے اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور فرمایا کہ بتا! اب میری رحمت سے تو جنت میں جائے گا یا اپنی عبادت سے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے تو نے دنیا میں کتنے ہزار لوٹے پانی پیے ہوں گے، ان کا بدلہ کون دے گا؟ کیا اب بھی تم اپنے اعمال کے بدلے جنت میں جانا چاہتے ہو، وہ فوراً سجدے میں گر جاتا ہے اور روتا ہوا کہتا ہے کہ اے اللہ! میں

نادان تھا، اپنی نادانی کی وجہ سے غلطی کر بیٹھا، مجھے معاف فرما دیجیے! اللہ اس کو معاف کر دیتے ہیں اور جنت میں داخل کر دیتے ہیں۔ اب بتاؤ بھائی! کوئی اپنے اعمال پر اعتماد کر سکتا ہے؟ اللہ ہم پر اپنا فضل فرمائے۔

(المستدرک للحاکم :۴/۲۷۸،شعب الإیمان:۴/۱۵۱)

عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی عاجزی

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ ایک مرتبہ مجلس میں بڑے بے چین تھے، مضطرب تھے، پوچھا گیا کہ حضرت کیا بات ہے؟ کیوں پریشان ہیں؟ تو فرمایا کہ میں نے آج ایک جرأت کا کام کر لیا ہے، جس کی وجہ سے افسوس ہو رہا ہے اور پریشانی ہو رہی ہے کہ میں نے کتنی بڑی جرأت کی ہے، لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا کام کر دیا ہے؟ تو فرمایا کہ آج میں نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے جنت مانگ لی، میں کہاں اس کا حق دار ہوں کہ میں نے اس کی مانگ کی ہے؟!

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی عاجزی

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کہتے تھے کہ اے اللہ! مجھ جیسا گنہ گار جنت نہیں مانگ سکتا، اتنی درخواست کرتا ہوں کہ جنتیوں کی جوتیوں میں جگہ عطا فرما دے اور فرماتے کہ یہ جنتیوں کی جوتیوں میں رکھنے کا سوال بھی اس لیے کرتا ہوں کہ دوزخ کو برداشت کرنے کی سکت نہیں ہے؛ ورنہ تو میں دوزخ کا حق دار تھا۔

یہ حضرات بھی عجیب تھے، علم و عمل، تقویٰ و طہارت، عبادت و ریاضت، سب ہے؛ مگر عاجزی کا یہ عالم اور ایک ہم ہیں کہ کرتے تو کچھ نہیں؛ مگر جنت سے کم پر راضی ہی نہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کے پوری طرح مستحق ہیں۔

حاجی امداد اللہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہ کی تواضع

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رَحِمَہُ اللّٰہ اتنے بڑے آدمی تھے، شیخ المشائخ تھے ہزاروں علما وصوفیا کے رہبر تھے، پھر بھی دعا میں رات میں اُٹھ کر یوں کہتے کہ اے اللہ! میرے پاس کچھ نہیں ہے، بالکل خالی ہوں؛ مگر تیرے بہت سے نیک بندے مجھے اچھا سمجھتے ہیں، ان کے نیک گمان اور ان کے طفیل سے میری مغفرت فرما دے، سوچیے! اتنے بڑے بڑے لوگ جن کا علم وعمل، اور تقویٰ وزہد، بے نظیر تھا، وہ بھی اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

شانِ عبدیت

اللہ تعالیٰ کو عبدیت و عاجزی بہت پسند ہے؛ اسی لیے قرآن میں ہمارے نبی حضرت محمد صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی اسی شان کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ (الاسراء: ۱)

(پاک ہے وہ ذات جس نے راتوں رات اپنے بندے کو سیر کرائی۔)

یہ معراج کے واقعے کا تذکرہ ہے اور یہاں آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو ''عبد'' یعنی ''بندہ'' فرمایا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو یوں بھی فرما سکتے تھے کہ ''پاک ہے وہ ذات جس نے راتوں رات اپنے نبی کو سیر کرائی، یا اپنے محبوب کو سیر کرایا'' مگر اس کے بجائے ''عبد'' کہہ کر یہ بتا دیا کہ دراصل اتنا بڑا مقام آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو عبدیت (غلامی) ہی کی وجہ سے ملا ہے، معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا مقام، مقامِ عبدیت ہے اور اسی سے ساری عظمتیں اور بلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور جہاں عبدیت ختم ہو جاتی ہے، وہاں شرافت وعظمت بھی ختم ہو جاتی ہے؛ اس لیے

عاجزی وتواضع نہایت ضروری ہے سالک کے لیے؛ اس لیے ہمیشہ عبادت کرنے کے بعد یوں کہے کہ اے اللہ! میں تیرے شایانِ شان کچھ نہیں کرسکا، میں آپ کا کوئی حق ادا نہیں کرسکا، میں اپنی کمزوریوں وعیبوں کا اعتراف کرتا ہوں، حدیث میں آتا ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرمایا کرتے تھے:

"لَا أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ"

(اے اللہ! میں تیری شایان شان تعریف نہیں کرسکتا، آپ کی ذات ایسی ہے جیسا کہ آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے۔) (الصحیح للمسلم:۷۵۱/الجامع للترمذي:۳۴۱۵)

جب اللہ کے شایانِ شان تعریف بھی نہیں کی جاسکتی، تو اللہ کے شایانِ شان عبادت کیسے کی جاسکتی ہے؟ اور جب سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ فرماتے ہیں، تو ہما شما کا کیا کہنا؟

"مرید صادق" کی تعریف

ایک مجلس میں فرمایا: میں نے حضرت مجدد الف ثانی رَحِمَہُ اللہُ کے مکتوبات میں حضرت مجدد صاحب رَحِمَہُ اللہُ کی ایک عجیب بات پڑھی اور پڑھ کر کچھ دیر تک میرا سر چکرانے لگا اور میں حیرت میں ڈوب گیا، حضرت رَحِمَہُ اللہُ نے پہلے تو یہ نقل کیا کہ ایک بزرگ نے فرمایا کہ مرید صادق تو وہ ہے، جس سے بیس (۲۰) سال تک کوئی گناہ صادر نہ ہوا ہو اور بیس (۲۰) سال تک اس کے بائیں ہاتھ کا فرشتہ کچھ بھی نہ لکھ سکے، اس کو لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ لیکن میرا خیال تو اپنے بارے میں یہ ہے کہ شاید میرے دائیں ہاتھ کا فرشتہ بیس (۲۰) سال سے کچھ بھی نہ لکھا ہوگا؛ کیوں کہ میں نے کوئی نیکی ہی نہیں کی اور میرے بائیں ہاتھ کے فرشتے کو لکھنے سے فرصت ہی نہ ملتی ہوگی۔

بھائیو! دیکھا آپ نے کہ اتنے بڑے مجدد! اتنے بڑے مجتہد! اتنے بڑے صوفی و بزرگ! جنھوں نے الحادِ اکبری کو ختم کرنے سب سے پہلے قدم اُٹھایا اور اکبر نے جو رسوم ورواج جاری کیے تھے، ان کو ختم کرنے کے لیے ننگی تلوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور جنھوں نے دین کی حفاظت وصیانت کی خاطر اپنے آپ کو داؤ پر لگا دیا تھا، وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے اپنے اعمال پر بھروسہ نہیں ہے؛ بل کہ اپنی نیکوں کو نیکی بھی سمجھنے کی ہمت نہیں کر رہے ہیں اور اپنے آپ کو گنہ گار خیال کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ داہنی طرف کا فرشتہ تو بے کار بیٹھا ہوگا اور بائیں طرف کا فرشتہ بدی و برائی لکھنے میں ایسا مصروف ہوگا کہ اسے فرصت ہی نہ ہوگی۔

جب یہ حضرات یہ کہتے ہیں تو ہمارا اور آپ کا کیا ہوگا؟ کیا ہمیں اپنے عمل پر بھروسہ کر لینے کی اجازت ہوگی؟

استغفار بھی استغفار کے قابل

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا جو بہت بڑی زاہدہ عابدہ خاتون تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ ہمارا استغفار بھی استغفار کے قابل ہے یعنی جب ہم استغفار کرتے ہیں تو وہ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہوتا اور اس میں بھی ہم سے گستاخی ہو جاتی ہے، اس کے آداب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا؛ اس لیے اس استغفار پر پھر استغفار کرنا چاہیے۔

عاجز گنہ گار، متکبر عابد سے بہتر ہے

فرمایا: آدمی گناہ کر کے اپنے کو عاجز سمجھے، یہ بہتر ہے اس سے کہ نیکی کر کے اپنے کو بڑا سمجھے؛ کیوں کہ نیکی کر کے بڑائی میں مبتلا ہوگا تو ساری عبادت بے کار گئی، اس سے کیا فائدہ ہوا کہ آدمی محنت مجاہدہ کیا؛ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ملا؟ اس کے برخلاف ایک آدمی گناہ کر کے شرمندہ و پشیمان ہوا اور اس کی وجہ سے اس میں عاجزی

وانکساری پیدا ہو جائے، تو یہ عاجزی اس کے کام آئے گی۔

اللہ سے اللہ ہی کو مانگو

اللہ سے ہمیں کیا مانگنا چاہیے؟ دنیا والے تو اللہ سے دنیا مانگتے ہیں؛ مگر سالکین کو چاہیے کہ وہ اللہ سے اللہ ہی کو مانگیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ دعا میں کہا کرتے تھے :

تو کر بے خبر ساری خبروں سے مجھ کو ۔۔۔ الٰہی رہوں اک خبردار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ، کوئی کچھ مانگتا ہے ۔۔۔ الٰہی میں تجھ سے طلب گار تیرا

فرماتے ہیں کہ دنیا والے لوگ کچھ کچھ مانگتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ مجھے مال چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ ڈگری چاہیے، کوئی کہتا ہے کہ بنگلہ چاہیے؛ مگر میں اللہ سے اللہ ہی کو مانگتا ہوں۔

ایک حکایت

جیسے ایک قصہ ہے کہ سلطان محمود کا ایک غلام تھا، اس کا ایاز نام تھا، بادشاہ اُس سے بہت محبت کرتا تھا، دیگر درباریوں کو اسی بنا پر ایاز سے حسد ہو گیا کہ بادشاہ اس کو کیوں اتنا چاہتا ہے؟ بادشاہ نے اس کو بھانپ لیا اور لوگوں کو یہ بتانا چاہا کہ میں کیوں ایاز سے اتنی محبت کرتا ہوں؟ ایک دن بھرا ہوا دربار تھا اور یہ غلام ایاز، بادشاہ کی پشت پر کھڑا اس کو پنکھا جھیل رہا تھا، اِسی درمیان بادشاہ نے کہا: میرے دربار کی جو چیز جس کو پسند ہو، میری طرف سے اس کو اجازت ہے کہ اس چیز پر وہ ہاتھ رکھ دے، وہ چیز اس کو دے دی جائے گی، سارے ارکانِ دولت و مشیرانِ سلطنت اُٹھے اور انھوں نے اپنی اپنی پسندیدہ چیزوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بادشاہ کی اجازت سے اس کو اُٹھا لیا؛ مگر ایاز

خاموش اپنی جگہ کھڑا تھا، اس نے نہ کسی چیز پر ہاتھ رکھا نہ اس کو اُٹھانے کی کوشش کی، یہ دیکھ کر لوگ ایاز کو تکنے لگے کہ کتنا بڑا بے وقوف ہے کہ ایسی قیمتی چیزیں میسر آ رہی ہیں؛ مگر یہ نہ اپنی جگہ سے اُٹھتا ہے، نہ کسی چیز کو اُٹھاتا ہے، بادشاہ بھی یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: ایاز! کیا تم کو ہمارے دربار کی کوئی چیز پسند نہیں آئی؟ تم نے کسی چیز کو کیوں پسند نہ کیا؟ تو ایاز نے بڑا عجیب وبصیرت افروز جواب دیا، اس نے کہا کہ حضور! میں نے تو آپ کو پسند کرلیا ہے اور جب آپ میرے ہو گئے، تو سارا دربار میرا ہو گیا، اب مجھے کسی اور چیز کو پسند کرنے اور اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟

میرے دوستو! ایک مخلوق کا غلام جب اپنے آقا کی محبت میں اس مقام کو پہنچ سکتا ہے، تو کیا اللہ کی ذات اس سے گئی گزری ہے؟ لہٰذا اللہ سے اللہ ہی کو طلب کرو، جب اللہ مل جائے گا تو سب مل جائے گا، جیسے اُس غلام ایاز نے بادشاہ ہی کو مانگ لیا تھا، اگر کوئی چیز مانگتا، تو صرف وہ چیز اس کو ملتی، بادشاہ کی محبت نہ ملتی، اسی طرح اللہ سے دنیا مانگو گے تو دنیا ملے گی، دنیا والے دنیا مانگتے ہیں؛ مگر عقلمند لوگ اللہ سے اللہ ہی کو مانگتے ہیں، جب اللہ کو مانگ لیا تو اللہ اُس کا ہو گیا، جس کا اللہ ہو گیا سب کچھ اُس کا ہو گیا، جیسے کہتے ہیں: "من كان لله كان الله له" جس کا اللہ ہو گیا سب اس کا ہو گیا۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحب رحمہ اللہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے جلیل القدر خلیفہ تھے، انھوں نے اپنے اشعار میں اس مضمون کو اس طرح ادا کیا:

تصور عرش پر ہے، وقفِ سجدہ ہے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا، آسماں میرا، زمیں میری
اگر اک تو نہیں میرا، تو کوئی شیٔ نہیں میری
جو تو میرا تو سب میرا، فلک میرا، زمیں میری

عوام ہماری قدر نہیں کرتی

فرمایا: آج بعض علماء شکایت کرتے ہیں کہ عوام ہماری قدر نہیں کرتی ، ہماری توہین کرتی ہے، میں کہتا ہوں لوگ اُنہی علماء کی قدر نہیں کرتے ، جو اللہ سے نہیں ڈرتے؛ بل کہ اُلٹی سیدھی کرتے رہتے ہیں، اور جو علماء اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں، تقوی شعار ہوتے ہیں، تو ایسے علما کی عزت آج بھی لوگ کرتے ہیں، ایک مثال سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔ جیسے بنگلور کے شیخ کباب، اگر ان کو صرف مسالہ لگا کر بغیر پکائے لوگوں کو دیا جائے تو کوئی نہیں کھائے گا؛ بل کہ منہ میں رکھتے ہی سب تھوک دیں گے، حال آں کہ اس میں گوشت بھی ہوتا ہے، مرچ اور نمک اور دیگر مسالجات بھی ہوتے ہیں؛ مگر اسے آگ میں تپائے بغیر منہ میں رکھیں گے تو فوراً تھوک دیں گے؛ لیکن جب ان کو آگ میں تپایا جائے اور اس کے بعد اس کو کھانے کو دیں، تو سب مزے لے لے کر کھائیں گے۔ بعینہٖ اسی طرح علما اگر صرف علم حاصل کریں، مدرسے سے فارغ ہوجائیں؛ مگر اپنے آپ کو کسی بزرگ کے حوالے کر کے اصلاح کی آگ میں نہ تپائیں اور مجاہدات کی بھٹی میں نہ جلائیں، تو یہ کچے علما ہیں، لوگ ان کو اسی طرح تھوک دیں گے، جس طرح کچے گوشت کو تھوک دیتے ہیں، ہاں! اگر یہ مجاہدے میں پک جائیں تو پھر کوئی بے قدری نہیں ہوگی اور اگر کوئی اپنی بدذاتی سے کرے گا تو اس کا اثر خود اسی پر ہوگا، عالم کو اس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا؛ اس لیے علماء کو چاہیے کہ وہ ”عالم بالکتاب“ ہونے پر اکتفا نہ کریں؛ بل کہ ”عالم باللہ“ بنیں، ”عارف باللہ“ بنیں، متقی و پرہیزگار بنیں۔

حضرت شاہ ابرار الحق صاحب رَحِمَہُ اللہُ کا ارشاد

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا: ایک مرتبہ مرشدی حضرت شاہ ابرار الحق

صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کہیں تشریف لے جارہے تھے، کار میں سوار تھے، راستے میں جاتے ہوئے پٹرول ڈلوانے کے لیے پٹرول بنک پر کار روکی گئی، تو دیکھا کہ وہاں پٹرول ڈلوانے ایک پٹرول کا ٹینکر بھی کھڑا ہے، جس پر ہزاروں گیلن پٹرول لدا ہوا ہے، حضرت والا رَحِمَہُ اللّٰہُ نے یہ دیکھ کر فرمایا: یہ ٹرک باوجود اس کے اوپر ہزاروں گیلن پیٹرول لدا ہوا ہے، پھر بھی یہ ٹرک خود چلنے کے لیے پٹرول کا محتاج ہے؛ اس لیے ہے کہ اوپر والا پٹرول اس کے اندر گھسا ہوا نہیں ہے، صرف اوپر اوپر ہے، اگر یہ پٹرول اس کے اندر جاتا، تو یہ پٹرول بنک کے پٹرول کا محتاج نہ ہوتا، اسی طرح علما اگر علم تو حاصل کرلیں؛ لیکن وہ اوپر اوپر ہی رہے، زبان زبان پر رہے، دل کے اندر نہ جائے تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس سے دین کی گاڑی چل نہیں سکتی، جس طرح اس ٹرک کو اپنے پٹرول کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، علم اندر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس علم پر عمل کرے۔

بغیر تمرین کے صرف تدریس بے کار ہے

مدرسے میں حضرت والا کی مجلس طلبا کے لیے ظہر بعد کچھ دیر کے لیے ہوتی ہے، ایک دن اُس مجلس میں فرمایا کہ آج میں ظہر میں بعض طلبا کو دیکھ رہا تھا، کسی کا رکوع صحیح نہیں، کسی کا سجدہ صحیح نہیں، کوئی سجدے میں کہنیوں کو زمین پر رکھ رہا ہے، جو کہ سنت کے خلاف ہے، پھر فرمایا بڑی افسوس ناک بات ہے کہ مدرسے میں تدریس ہو رہی ہے، تحقیق ہو رہی ہے، تصنیف وتالیف ہو رہی ہے؛ مگر دین پر چلنے کی تمرین نہیں ہو رہی ہے، حال آں کہ درس میں نماز کے مسائل پر مالہ وما علیہ کے ساتھ بحث ہوتی ہے، اُن مسائل کی احادیث کی تخریج ہوتی ہے، راویوں پر جرح قدح ہوتی ہے، سند

پر زبردست کلام ہوتا ہے، یہ سب کچھ ہو؛ مگر رکوع ہی صحیح نہ ہو، سجدہ ہی صحیح نہ ہو، تو ایسی تدریس کا کیا فائدہ؟ اگر طلبا یہ مسائل تو جان لیں ؛مگر نماز صحیح نہ ہو، تو مدرسے پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ سب بے کار ہے۔

عبادت وریاضت اللہ کا فضل ہے-ایک واقعہ

فرمایا: جو بھی بندہ کچھ نیکیاں کرتا ہے، وہ محض اللہ کا فضل ہے، بندے کے عمل کو اس میں دخل نہیں، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا﴿ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً﴾ (الحجرات: ۸) (ان کا ایمان وعمل نتیجہ ہے، اللہ کے فضل وکرم کا)، تو بہ درجۂ اولیٰ ہماری عبادتیں اللہ کے فضل سے ہوں گی، مولانا رومی رحمۃ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک آقا اور اس کا ایک غلام بازار کچھ خریدنے گئے، راستے میں نماز کا وقت آ گیا، تو غلام نے کہا: ''آقا! میں مسجد میں نماز پڑھنے جانا چاہتا ہوں'' آقا نے اجازت دے دی اور خود باہر کھڑا ہو گیا، انتظار کرتا رہا، نماز کے بعد سب نمازی چلے گئے؛ مگر یہ غلام نہیں آیا، آقا نے باہر ہی سے آواز دی کہ اے فلاں! سب چلے گئے تو کیوں نہیں آتا؟ تو غلام نے کہا کہ مجھے آنے نہیں دیتے، یہ کہہ کر پھر رکعت باندھ کر نماز پڑھنا شروع کر دیا، پھر کچھ دیر بعد آقا نے آواز دی، غلام نے پھر وہی جواب دیا کہ مجھے آنے نہیں دیتے اور یہ کہہ کر پھر رکعت باندھ لی، پھر آقا نے انتظار کیا اور کچھ دیر بعد آواز دی اور کہا کہ کون آنے نہیں دیتا؟ غلام نے کہا کہ جو آپ کو اندر آنے نہیں دیتا، وہ مجھے باہر نکلنے نہیں دیتا، اس جواب پر جی چاہتا ہے کہ قربان ہو جاؤں! معلوم ہوا مسجد میں جانا اللہ ہی کی توفیق سے ہے، ہمارا کوئی کمال نہیں۔

ایک دن منزل ضرور ملے گی

فرمایا: جب آپ صحیح اللہ والا تلاش کرلیں گے، تو ایک دن ضرور اللہ تک رسائی حاصل کرلیں گے؛ اس لئے کہ اللہ کے راستے میں قدم رکھنے والا کبھی محروم نہیں ہوسکتا، آج نہیں تو کل، کبھی تو پہنچے گا۔ جیسے ایک آدمی کمزور بصارت والا چلتا ہے، آگے جاکر ایک جگہ ٹھوکر لگ کر گرجاتا ہے، پھر اُٹھتا ہے، ہمت کر کے چلتا ہے، تو وہ ایک دن ضرور منزل تک پہنچ جائے گا، اسی طرح ایک گنہ گار بندہ کسی اللہ والے کی اتباع کرلے، اُس کے پیچھے چلتا رہے، اگرچہ گناہوں نے اُس کو گرادیا ہو، شیطان نے زخمی کردیا ہو، کوئی مضائقہ نہیں، وہ کبھی نہ کبھی ضرور خدا تک رسائی پالے گا۔

لہٰذا اُٹھو! توبہ کرو اور اللہ سے کہو: اے اللہ! ضعیف بندہ ہوں، کمزور بندہ ہوں، طاقت نہیں ہے، لیاقت نہیں ہے، صلاحیت نہیں ہے؛ لیکن تیرے راستے میں چلنا ضرور چاہتا ہوں، میں تو میری نااہلی و ضعیفی سے گرتا رہوں گا، تو میرا ہاتھ ضرور پکڑے رہنا، میں زخموں سے کہیں چور چور ہوجاؤں گا، تو میرے زخموں کی مرہم پٹی کرتے رہنا، جیسے کسی بزرگ نے کہا:

ہم نے طے کیں اس طرح سے منزلیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے

اس شعر میں میں نے ذرا سی ترمیم کردی ہے:

ہم نے پائیں اس طرح سے رفعتیں
گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر اُڑے

اس میں اشارہ ہے کہ جو سالک کبھی نفس و شیطان کی چالوں و شرارتوں کا شکار ہوگیا اور گناہ کا ارتکاب کر بیٹھا؛ مگر فوراً اللہ کی طرف رجوع کیا اور نفس و شیطان کا

مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا ہوگیا، تو پھر وہ اللہ کی مدد سے نہ صرف یہ کہ منزلیں طے کرتا ہے؛ بل کہ رفعتیں اور بلندیاں پالیتا ہے اور چل کر نہیں، اڑ کے جاتا ہے؛ لہٰذا سالکین کبھی مایوس نہ ہوں؛ بل کہ عمل کے میدان میں برابر چلتے رہیں، اگر چہ گرتے پڑتے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ کے اعلیٰ ترین اخلاق

فرمایا میرے استاذ حضرت مفتی نصیر احمد صاحب رحمۃ اللہ نے کہ حضرت مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ کو جو خطوط آتے، میں ہی حضرت والا کو پڑھ کر سناتا تھا، ایک مرتبہ کچھ لوگوں کی طرف سے حضرت والا کو خطوط آئے جس میں گالیوں کی بھر مار تھی، گستاخانہ الفاظ تھے، تو میں ایسے خطوط پڑھے بغیر ایک طرف رکھ دیتا، تو حضرت والا کہتے کہ ان کو کیوں نہیں پڑھتے؟ ان کو بھی پڑھو، میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ خطوط پڑھنے کے قابل نہیں ہیں؛ کیوں کہ ان میں گالیاں اور دھمکیاں لکھی ہیں، ان کو کیا پڑھوں؟ اس پر حضرت والا رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ دراصل اللہ کی طرف سے ہماری اصلاح کا انتظام ہے؛ کیوں کہ لوگ ہمیں ''حضرت حضرت'' کہہ کر ہمارے دماغ کو عرشِ معلیٰ پر پہنچا دیتے ہیں، اس سے بڑائی و عجب پیدا ہوسکتا ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے ہماری اصلاح فرماتے ہیں، یہی لوگ تو ہیں جو ہماری اصلاح کرتے ہیں، ہمارے اندر بڑائی آنے نہیں دیتے، یہ تو ہمارے مصلح ہیں۔

اللہ اکبر! کیا ظرف تھا ان حضرات کا! ایک تو یہ ہے کہ آدمی اخلاق جانے، بیان کرے، یہ تو بہت سے لوگ کر لیتے ہیں؛ مگر ان اخلاق کو عملی جامہ پہنانا، یہ بڑا کام ہے، سب کے بس کی بات نہیں ہے۔

شیخ کو احوال کی اطلاع دینا ضروری ہے

ایک مرتبہ احقر مرتب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ اصلاحی تعلق قائم کرنے کے بعد حسبِ ہدایت احوال لکھ کر دکھانا چاہتا ہوں؛ مگر دل میں یہ خیال آتا ہے کہ احوال میں دو چیزیں ہوتی ہیں: یا تو سالک اپنے اندر خوبیاں پاتا ہے یا خامیاں، خامیوں کی اطلاع شیخ کو کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرما دیں گے اور خوبیاں بھی شیخ کو بتانے کی ضرورت نہیں؛ اس لیے کہ بندے کا اپنی خوبیوں کو خوبیاں سمجھنا ہی غلط ہے؛ کیوں کہ انسان کی کوئی بھی نیکی اللہ کے شایانِ شان نہیں ہوسکتی۔

تو حضرت نے فرمایا کہ یہ خیال غلط ہے؛ کیوں کہ گناہ کے بعد صرف توبہ کافی نہیں ہوتی؛ بل کہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہوتی ہے؛ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿ إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَأَصْلَحَ ﴾ (مگر وہ جو توبہ کرے اور ایمان لا کر اپنی اصلاح کرے) معلوم ہوا کہ توبہ کے بعد اصلاح بھی ضروری ہے اور اصلاح اطلاعِ احوال کے بغیر کیسے ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ شیخ کا صاحبِ کشف و صاحبِ الہام ہونا ضروری نہیں، پھر فرمایا کہ جب تک ڈاکٹر کو مریض اپنا مرض نہیں بتائے گا، صحیح علاج نہیں ہوگا، جب تشخیص صحیح ہوگی تو تجویز بھی صحیح ہوگی؛ اس لیے اپنی خامیاں جو جانتا ہو، وہ شیخ کے سامنے بیان کرے؛ تا کہ صحیح اصلاح ہو، رہا مسئلہ خوبیوں کا، تو وہ بھی بتائے اور فرمایا کہ انسان کا یہ سمجھنا کہ میں فلاں فلاں نیکی کرتا ہوں یہ غلط نہیں؛ بل کہ نیکیاں کر کے اپنے آپ کو باکمال سمجھنا غلط ہے۔

فطرت بدل نہیں سکتی

ایک مجلس میں فرمایا: انسان کے اندر ایک عادت ہوتی ہے، ایک فطرت ہوتی ہے، عادت بدل سکتی ہے؛ مگر فطرت بدل نہیں سکتی؛ اسی لیے ایک حدیث میں حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرمایا:

"إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهِ فَصَدِّقُوْهُ وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ زَالَ عَنْ خُلُقِهِ فَلاَ تُصَدِّقُوْهُ." (مسند أحمد:٦/٤٤٣)

(اگر تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل گیا، تو اس کی تصدیق کرلو اور اگر کسی آدمی کے بارے میں سنو کہ اس کی فطرت بدل گئی، تو اس کی تصدیق نہ کرو۔)

معلوم ہوا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے؛ مگر کسی کی فطرت بدل نہیں سکتی؛ لہٰذا کسی کی فطرت ہی میں برائی ہو، تو چوں کہ فطرت نہیں بدل سکتی؛ اس لیے اُس فطرت کا رُخ بدل دے اور یہ ہوسکتا ہے، پھر فرمایا: دیکھو! حالتِ کفر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فطرت میں سختی اور غصہ تھا اور وہ اسلام لانے کے بعد بھی باقی رہا؛ مگر پہلے اسلام کے خلاف یہ غیظ و غضب و شدت تھی اور ایمان لانے کے بعد یہی شدت و غیظ و غضب کفر کے خلاف برتنے لگے، فطرت تو باقی رہی؛ مگر رُخ بدل گیا۔

اس پر اہلِ مجلس میں سے کسی نے سوال کیا کہ کسی کی فطرت میں ریاکاری ہو، تو اُس کا رُخ کیسے بدلے، تو فرمایا: پہلے لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتا تھا، اب اللہ کو دکھانے کے لیے کرے، اسی کو اخلاص کہتے ہیں، جو ریاکاری ایک گناہ کا کام تھا، وہ رُخ بدلنے سے ثواب کا کام ہو جائے گا؛ کیوں کہ بعض لوگوں میں کسی بھی کام کو دکھا کر کرنے کی فطرت ہوتی ہے، اس دکھاوے کا رخ اگر مخلوق کی طرف ہو تو بُرا ہے

اور اللہ کی طرف ہو تو اچھا ہے۔

خوابوں کی حقیقت

آج کل لوگوں کو خواب بہت نظر آتے ہیں اور ان پر کلی بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں لاتے، حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس سلسلے میں ایک بڑی قیمتی بات فرمائی ہے کہ اگر انسان کی جاگنے کی حالت درست ہو، تو کتنا بھی بُرا خواب دیکھے، کچھ فرق نہیں پڑے گا، اگر جاگنے کی حالت درست نہ ہو، تو کتنا ہی عمدہ خواب دیکھ لے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا، ڈاڑھی نہیں رکھتا، اللہ سے نہیں ڈرتا، ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ خود جبرئیل بن گیا ہے، یا عرش پر پہنچ گیا ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، اس کے برخلاف کوئی نمازی ہو، اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتا ہو، اوامر بجالاتا ہو، نواہی سے اجتناب کرتا ہو، اگر ایسا انسان خواب میں یہ دیکھے کہ وہ شیطان بن گیا ہے، کوئی ڈرنے کی بات نہیں، اس لیے کہ اللہ قیامت میں اچھا خواب دیکھنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ دیں گے کہ بھائی تم دنیا میں بڑے اچھے خواب دیکھتے تھے؛ اس لیے جنت میں چلے جاؤ اور ایسا بھی نہیں کہ جو برے خواب دیکھے اُسے یوں کہہ دیں کہ تم نمازی تو تھے، پرہیز گار تو تھے؛ مگر برے خواب دیکھتے تھے، اس لیے جہنم میں چلے جاؤ، ایسا نہیں ہوگا، وہاں تو اعمال کا اعتبار رہے، خواب کچھ بھی ہو۔ کیا عجیب اُصول حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا!!! اسی لیے تو حکیم الامت کا لقب دیا گیا ہے۔

ہاں اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواب کی کوئی حقیقت نہیں؛ بل کہ خواب کی حقیقت ہے اور اس کو حدیث میں نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے؛ مگر یہ بھی یاد رکھنا

چاہیے کہ سب کے خواب اور ہر وقت کے خواب معتبر نہیں ہوتے ؛ بل کہ خواب کی تین قسمیں ہیں : ایک خیالی خواب ، ایک شیطانی خواب اور ایک الہامی خواب ؛ اس لیے خواب پر کلی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ؛ بل کہ دیکھا جائے گا کہ کس قسم کا خواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صاحب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا سر کٹ گیا ہے ، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسی آ گئی ، آپ نے ہنس کر فرمایا:

" إِذَا لَعِبَ الشَّيْطَانُ بِأَحَدِكُمْ فِي مَنَامِهِ فَلاَ يُحَدِّثْ بِهِ النَّاسَ. "

(شیطان تم میں سے کسی کے ساتھ خواب میں کھلواڑ کرے ، تو یہ خواب لوگوں کو بتاتے نہ پھرو) (الصحیح للمسلم:۴۲۱۳، مسند أحمد:۱۳۸۶۴)

دیکھیے ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ اس طرح کے بے تکے خواب بیان نہ کرو ، اگر ہر خواب کوئی حقیقت رکھتا تو آپ یہ کیوں فرماتے ؟!

اللہ سے دین مانگو

مولانا حفظ الکبیر صاحب رحمہ اللہ "جامعہ مفتاح العلوم ، جلال آباد" میں بہ حیثیتِ مبلغ مقرر تھے اور حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (مہتمم دار العلوم دیوبند) کے خلیفہ تھے ، ہماری طالب علمی کے دور میں جلال آباد میں حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ جہاں نماز پڑھتے تھے ، اسی مسجد میں وہ جمعہ سے پہلے وعظ کہا کرتے تھے ، ان کی باتیں بڑی دلچسپ بھی ہوتی تھیں اور بڑی کام کی بھی ، وہ اپنے وعظ میں کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اللہ سے دین مانگتا ہے ، تو اللہ اسے دین بھی دیتا ہے اور دنیا بھی دیتا ہے اور اگر کوئی اللہ سے دنیا مانگتا ہے تو صرف دنیا دی جاتی ہے ، دین نہیں دیا جاتا ، یہ کہہ کر مولانا ایک بڑی عمدہ مثال دیتے کہ جیسے آپ اگر کسی

سے پانی مانگو گے تو صرف پانی نہیں؛ بل کہ گلاس بھی ساتھ میں آئے گا، اسی طرح دودھ، چائے، کھانا وغیرہ مانگو گے، تو مظروف کے ساتھ ظرف بھی آئے گا، اس کے برخلاف اگر آپ نے کسی سے کہا کہ گلاس لاؤ یا پلیٹ لاؤ یا کٹورا لاؤ، تو لانے والا صرف گلاس یا پلیٹ یا کٹورا ہی لائے گا، اس کے ساتھ مشروب یا ماکول نہیں آئے گا، وہ فرماتے تھے کہ اسی طرح اللہ سے اللہ مانگو گے، دین مانگو گے، تو اللہ دنیا کے کٹورے یا پلیٹ میں رکھ کر دین کی دولت دیں گے، چناں چہ جو اولیاء اللہ ہوتے ہیں، وہ دنیا سے محروم نہیں ہوتے، حال آں کہ وہ دنیا نہیں مانگتے، وہ اللہ سے دین مانگتے ہیں؛ مگر اللہ تعالیٰ ساتھ میں دنیا بھی دیتے ہیں اور ایسا سکون دیتے ہیں کہ وہ اسباب کے پیچھے نہیں پڑتے اور اگر دنیا مانگو گے تو صرف دنیا دی جائے گی، دین نہیں دیا جائے گا، جیسے پلیٹ و گلاس مانگنے والے کو صرف پلیٹ و گلاس دئے جاتے ہیں، اس میں کھانا پانی رکھ کر نہیں دیا جاتا۔

محبت میں اعتدال ہو

اسلام ہر چیز میں اعتدال سکھاتا ہے، حتی کہ دین پر چلنے میں بھی اسی کی تعلیم دی گئی ہے، سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت بڑی چیز ہے؛ مگر اس میں بھی اعتدال مطلوب ہے، ایک نوجوان نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر دیجیے کہ مجھے اللہ سے بے پناہ محبت ہو جائے، اولاً تو عیسیٰ علیہ السلام نے انکار کیا؛ مگر جب اس نے بہت اصرار کیا تو اُنھوں نے دعا کر دی، دعا قبول ہو گئی اور اسے بے پناہ محبتِ الٰہیہ دے دی گئی؛ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے ہوش اُڑ گئے۔

اور ایسا ہو سکتا ہے، ارے بھائی! جب اس فانی دنیا کے عشق میں کوئی گرفتار ہو کر پاگل ہو سکتا ہے، تو اللہ سے محبت کرنے والا پاگل کیوں نہیں ہو سکتا، مولانا

روم رَحمۃُ اللہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

عشق مولیٰ کئے کم بود از عشق لیلیٰ

مولیٰ کا عشق، لیلیٰ کے عشق سے کیسے کم ہو سکتا ہے، چناں چہ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں ہمیشہ مدہوش رہتا تھا، کچھ خبر نہیں رہتی تھی، ایک جگہ جا رہا تھا، ایک صاحب نماز میں کھڑے ہوئے تھے، مجنون سامنے سے گزر گیا، نمازی صاحب کو بڑا غصہ آیا، جلدی سے نماز ختم کی اور جا کر اُس کو پکڑا اور ڈانٹنے لگے: سمجھ نہیں ہے تجھے؟ دیکھا نہیں؟ اندھے کی طرح جا رہا ہے؟ تو وہ کہنے لگا کہ ایک دنیا کی لیلیٰ کی وجہ سے میرا یہ حال ہے کہ آپ وہاں کھڑے تھے یا نہیں، مجھے وہ بھی ہوش نہیں ہے، تم کیسے خدا کے عاشق ہو کہ نماز میں کھڑے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے؟! چاہیے تو یہی تھا کہ اللہ کے عشق میں پاگل ہو جاتے؛ مگر اسلام ایک معتدل مذہب ہے، اسلام یہ نہیں چاہتا کہ لوگ پاگل ہو جائیں؛ بل کہ شریعت چاہتی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلتا رہے، بیوی کے حقوق بھی ادا کرنا ہے، تجارت بھی کرنا ہے؛ کیوں کہ اسلام ایک معقول مذہب ہے، اگر کوئی شخص بیوی کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص والدین کی عظمت نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص بچوں کا حق ادا نہیں کرتا تو اللہ خوش نہیں ہوتا، پڑوسیوں کے ساتھ احسان وسلوک کا معاملہ نہ کرے تو اللہ خوش نہیں ہوتا، جیسے انسان کے اندر چار چیزیں ہوتی ہیں: خون، بلغم، سودا، صفرا۔ ان کو اخلاطِ اربعہ کہتے ہیں، ان کو اللہ نے ایک خاص توازن (LEVEL) کے ساتھ ہمارے اندر رکھا ہے، جب یہ اعتدال پر ہوں تو ہماری طبیعت ٹھیک رہتی ہے، جب ان میں افراط تفریط پیدا ہو جائے تو ہماری طبیعت بگڑ جاتی ہے، اسی طرح روحانی سلسلے میں بھی ہے کہ ہر چیز اپنے اپنے حد کے اندر رہے، کمی بیشی نہ ہو، اللہ کا خوف اپنی حد میں رہے

اور اللہ کی محبت ہے تو وہ اپنی حد میں رہے۔

سات آدمی عرش کے سایے میں

حدیث میں ہے کہ امامِ عادل، انصاف پسند حاکم قیامت کے دن عرش کے سایے میں ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہر آدمی تو حاکم نہیں بن سکتا، ایک حاکم ہوگا تو لاکھوں محکوم ہوں گے، تو کیا یہ فضیلت صرف حاکم کے لیے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امام عادل سے اگرچہ حاکم و بادشاہ مراد ہے؛ مگر اس کے عموم میں ہر وہ شخص داخل ہے، جس کو اللہ نے چھوٹی بڑی کسی بھی قسم کی حکومت دی ہو۔

مثلاً ہر آدمی کو اللہ نے کسی نہ کسی قسم کی حکومت دی ہے: کسی کو بیوی پر، کسی کو بچوں پر، کسی کو شاگردوں پر، کسی کو مریدوں پر، کسی کو ماتحت کام کرنے والے نوکروں پر؛ لہٰذا جو بھی اپنے ماتحت کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرے گا، وہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عموم میں داخل ہو کر اس فضیلت میں حصہ دار بنے گا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ گھر کا ہر بڑا اپنے گھر کا حاکم ہوتا ہے، چناں چہ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿الرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ﴾ (مرد عورتوں پر حاکم ہوتے ہیں) (النساء: ۳۴)

اگر کسی کے بچے ہیں یا اور خدام وغیرہ ہیں، تو وہ آدمی اُن سب کا بادشاہ و حاکم ہے، اس طریقے پر آدمی اپنی بیوی، بچوں اور خدام اور دیگر ماتحت لوگوں کے ساتھ انصاف و حسن سلوک کا معاملہ کرے گا، تو وہ بھی امامِ عادل کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

ایک قرآنی دعا کی تفسیر

قرآن میں ہے ﴿وَجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان: ۷۴) اس میں دعا

سکھائی گئی ہے کہ اے اللہ! ہمیں متقیوں کا امام بنادے۔ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللہُ فرماتے ہیں کہ یہاں متقیوں کی امامت مقصود نہیں؛ بل کہ یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! میں گھر کا امام تو ہوں، اگر ہمارے گھر والے فاسق رہیں گے، تو میں امام الفاسقین ہوجاؤں گا، آپ ہمارے گھر والوں کو نیک و متقی بنادیں، تاکہ میں امام المتقین ہو جاؤں؛ اسی لیے اللہ نے یہ دعا سکھلائی کہ بیوی متقی ہو تو یہ متقیہ کا امام ہوگا، بچے متقی ہوں تو متقی اولاد کا امام ہوگا، اگر خدانخواستہ بچے فاسق ہوں، بیوی فاسقہ ہو، تو یہ فاسقوں کا امام ہوگا، بہت سے لوگ پریشان ہوکر کہتے ہیں کہ ہمارے بچے بگڑ چکے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ دعا اہتمام سے مانگنا چاہیے، اس طرح انسان امامِ عادل کی فضیلت میں داخل ہوجائے گا۔

حاکم کی دوسری شرح

حضرت حکیم اختر صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے امامِ عادل کی ایک عجیب شرح کی ہے، وہ یہ کہ ہر انسان کی دو گز کی مملکت ہے، وہ ہے انسان کی باڈی (جسم) جس میں صوبے بھی ہیں، آنکھ ایک صوبہ ہے، کان ایک صوبہ ہے، دماغ ایک صوبہ ہے، پیٹ ایک صوبہ ہے اور ان کا دارالسلطنت دل ہے، یہ سب ملا کر ایک سلطنت قائم ہوگئی؛ لہٰذا جو بھی اپنی اس مملکت پر عدل وانصاف قائم کرے گا، وہ بھی امامِ عادل میں شامل ہے، یہ عاشقانہ تشریح ہے۔

عدل کیا ہے؟

اس حدیث میں امام کے ساتھ عادل کی صفت بھی لگی ہوئی ہے؛ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عدل کی کیا تعریف ہے؟ اس کا جواب عدل کی ضد کو سمجھنے سے معلوم

ہوگا؛ کیوں کہ اشیا تو اضداد ہی سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے کہتے ہیں: (تُعْرَفُ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا) اگر آپ کو دن سمجھنا ہو تو رات کو سمجھئے، اگر یہ سمجھنا ہے کہ کالا کسے کہتے ہیں؟ تو گورے کو سمجھئے، اگر آپ کو یہ سمجھنا ہے کہ حسین کسے کہتے ہیں؟ تو قبیح کو سمجھئے، اگر دنیا میں سارے کے سارے حسین ہوتے، تو حسینوں کی اہمیت نہ ہوتی، بدشکلوں نے حسینوں کا مرتبہ بڑھا دیا؛ ورنہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا، اسی طرح عدل کی پہچان ظلم سے ہوتی ہے؛ اس لیے عدل کی ضد کو جاننا چاہیے اور عدل کی ضد ہے ظلم اور ظلم کہتے ہیں ہر اس کام کو جو اللہ کی مرضی کے خلاف ہو۔ قرآن میں اللہ نے گنہ گاروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ﴾ (انھوں نے (گناہ کرکے) اپنے آپ پر ظلم کیا) معلوم ہوا نافرمانی کرنا ظلم ہے؛ لہٰذا جو اپنی نظر کی حفاظت نہیں کرتا اور اس کو نافرمانی سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے کانوں کو نافرمانی سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو زبان کو غلط استعمال کرنے سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں، جو اپنے دل کو گندے خیالات سے نہیں بچاتا، وہ ظالم ہے عادل نہیں؛ اس لیے امام عادل بننا ہو تو اپنی اس مملکت میں ظلم کو در آنے کا موقعہ نہ دیں۔

ہمارا بدن اللہ کا باغ ہے

یاد رکھو کہ ہمارا بدن اللہ کا بنایا ہوا باغ ہے، اس کی پرورش اور دیکھ بھال مالکِ باغ کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے، ہم صرف اس باغ کے مالی ہیں، مالک نہیں، اس لیے اس باغ میں ہم صرف وہی کام کر سکتے ہیں، جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہوں؛ لہٰذا ہمیں زبان کو غلط استعمال کرنے کی اجازت نہیں اور اسی لیے غیبت حرام ہے، جھوٹ حرام ہے، بہتان طرازی حرام ہے، چغل خواری حرام ہے؛

کیوں کہ مالک نے زبان کو ان چیزوں میں استعمال کی اجازت نہیں دی ہے، اسی طرح ڈاڑھی کٹانے کی اجازت نہیں اور ٹخنے ڈھانکنے کی اجازت نہیں؛ کیوں کہ مالک نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، جس طرح دنیا میں بھی باغ ہوتے ہیں، وہاں آپ مالک کی اجازت کے بغیر ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے ،کوئی تصرف تو دور کی بات ہے،اسی طرح اللہ کے اس باغ میں بھی ہم اپنی مرضی سے تصرف نہیں کر سکتے، سارے اعضا اس کی مرضی کے مطابق چلیں گے۔

اس سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ جو آدمی اس بدن میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا ہے اور حرام کاموں کا ارتکاب کرتا ہے، وہ اللہ کے اس باغ کو مالک کی مرضی کے بغیر تصرف میں لانے والا خائن ہے ،جس کے بارے میں پوچھ ہوگی اور اس کو جواب دینا ہوگا۔

ایک لطیفہ

ایک جنٹل مین ایک مولانا سے کہنے لگے کہ مولویوں کو کیا ہو گیا کہ وہ ڈاڑھی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ،تو مولانا نے جواب دیا کہ ہم کہاں پڑے ہوئے ہیں، ڈاڑھی کے پیچھے تو آپ لوگ پڑے ہوئے ہیں کہ ذرا سی بڑھی اور کاٹ دی، ذرا سی بڑھی پھر کاٹ دی اور ہم تو ڈاڑھی چھوڑے ہوئے ہیں۔

ڈاڑھی رکھنا فطرت ہے- ایک لطیفہ

ایک صاحب حضرت مولانا سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ڈاڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے، کیوں کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ڈاڑھی نہیں ہوتی ،حضرت نے فرمایا: پھر تو آپ اپنے دانت بھی توڑ لیجیے؛ کیوں کہ وہ

بھی فطرت کے خلاف ہیں؛ اس لیے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو دانت بھی نہیں ہوتے، قریب میں مولانا عبدالحی صاحب بڑھانوی رحمۃ اللہ بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے: واہ! کیا دنداں شکن جواب دیا!!

جس کا خدا ایسا ہو - ایک واقعہ

فرمایا: حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ کے پاس ایک عورت اپنے شوہر کی شکایت لے کر آئی اور کہنے لگی: حضرت! میں اتنی حسین ہوں، پھر بھی میرا شوہر دوسری عورتوں کی طرف نظر کرتا ہے اور غیر عورتوں کے پاس جاتا ہے، اور میری طرف کوئی التفات نہیں کرتا، پھر کہنے لگی کہ اگر شریعت میں پردے کا حکم نہ ہوتا تو میں اپنا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر بتاتی کہ مجھے اللہ نے کیسا حسین بنایا ہے۔ یہ سن کر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ بے ہوش ہو گئے، ہوش آنے کے بعد مریدین نے پوچھا کہ حضرت! کیا بات تھی، کیوں آپ پر غشی طاری ہو گئی؟ حضرت نے فرمایا کہ تم نے اس عورت کی بات سنی نہیں؟ وہ کیا کہہ رہی تھی کہ میرے جیسی حسین عورت کے ہوتے ہوئے بھی میرا شوہر دوسروں کی طرف نظر کرتا ہے، یہ سن کر مجھے ایک حدیث قدسی یاد آ گئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ فرماتا ہے: جس کا خدا میرے جیسا ہو، کیا وہ بندہ مجھے چھوڑ کر دوسروں کی طرف نظر کر سکتا ہے؟ سورج کو دیکھو، چاند کو دیکھو، کتنے حسین ہیں؟! تو ان کو بنانے والا کیسا حسین ہوگا؟! جو مٹھاس کو پیدا کرنے والا ہے، اس میں کیسی مٹھاس ہوگی؟! ماں کے دل میں محبت پیدا کرنے والا خدا، بندوں سے کتنی محبت کرتا ہوگا؟! ایسے خدا کو چھوڑ کر ہم کہاں بھٹک رہے ہیں؟!! (فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ)

مقتدیٰ کا معیار-لوگوں کے نزدیک

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہو۔)

اس میں اللہ تعالیٰ نے ''صادقین'' کی معیت اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ہم کس کی اتباع کریں؟ کس کے پیچھے چلیں؟ یہ ایک گھمبیر مسئلہ ہے؛ کیوں کہ ہر ایک آج یہی چاہتا ہے کہ لوگ میری اتباع کریں، آج لوگ مختلف معیار متعین کر رکھے ہیں، کوئی خاص منصب کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی شہرت کو معیار قرار دیتا ہے، کوئی مال داری کو معیار قرار دیتا ہے، تو کوئی عہدوں کو معیار مانتا ہے؛ مگر یہ لوگوں کے اُصول وضابطے، قرآن وحدیث کے اُصول وضابطوں سے میل نہیں کھاتے۔

مقتدیٰ کا معیار- قرآن کی نظر میں

میں کہتا ہوں کہ ہمیں معیار متعین کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ جب قرآن کریم کسی کی اتباع میں زندگی گزارنے کا حکم دے رہا ہے، تو مقتدیٰ کی تعیین اور نشاندہی بھی قرآن کریم کی ذمے داری ہے، چناں چہ قرآن کریم نے اس مسئلے کو صاف کر دیا ہے، ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ﴾ (لقمان:۱۵) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے شخص کی اتباع کرو، جو میری طرف متوجہ ہے، قرآن نے کیا عجیب اصول بیان کیا ہے مقتدیٰ کے انتخاب کا!! فرمایا کہ جو میری یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو، اُس کی اتباع کرو، جس پر اللہ کے عشق کا رنگ چڑھا ہوا ہو، ذکر کا رنگ چڑھا ہوا ہو، اس کی اتباع کرو، یہ نہیں فرمایا کہ جس کا علم زیادہ ہو،

اُس کی اتباع کرو، جس کی شہرت زیادہ ہو، اُس کی اتباع کرو، جو عہدے والا ہو، اُس کی اتباع کرو؛ بل کہ یہ فرمایا کہ جو اللہ کی طرف نظریں جمائے ہوئے ہو، جسے ہر آن اس کی رضا کا فکر ہو، اس کی خوشنودی کی جستجو ہو، اُس کی اتباع کرو۔

اسی طرح قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الأنبياء: ۷) (اگر تمھیں علم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھو!) یہ آیت بڑی قابلِ لحاظ ہے، اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ موقعہ ایسا تھا کہ یہاں ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ کی جگہ (فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الْعِلْمِ) کہنا چاہیے تھا؛ کیوں کہ یہاں علم نہ رکھنے والوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؛ لہٰذا اہلِ علم سے علم حاصل کرنے کا حکم دینا چاہیے تھا؛ کیوں کہ علم نہ ہو تو علم والوں سے ہی پوچھتے ہیں، نہ کہ جہلا سے۔ جیسے مال نہ ہو تو مال دار سے مانگا جاتا ہے نہ کہ فقیر سے، اسی طرح علم نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھا جاتا ہے، نہ کہ اہلِ ذکر سے؛ مگر اہلِ ذکر سے پوچھنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ علم اُسی وقت سود مند و نافع ہوتا ہے، جب علم کے ساتھ اللہ کا ذکر بھی ہوتا ہو، جس علم کے ساتھ اللہ اور رسول کی اتباع ہوتی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخِيَارِكُمْ ؟ قَالُوْا: بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !! قَالَ : خِيَارُكُمُ الَّذِيْنَ إِذَا رُؤُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ." (السنن لابن ماجة:۴۱۰۹)

یعنی اللہ والے وہ ہیں جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔ یہ ہے اصل معیار اللہ والے کا جسے مقتدیٰ بنایا جا سکتا ہے؛ ورنہ ہر جبہ قبہ والا، اللہ والا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ ہر سفید چیز چاندی نہیں ہوتی اور ہر پیلی چیز سونا نہیں ہوتی، اسی طرح ہر علم والا اور ہر تقریر کرنے والا، قابلِ اتباع اور مقتدیٰ نہیں ہو سکتا؛ بل کہ اس علم کے ساتھ ذکر وانابت،

تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت، عبادت وریاضت جیسی صفات کا ہونا بھی لازم ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تو ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ''امیر جیسا بھی ہو اُس کی اتباع کرو'' ایک حدیث میں فرمایا کہ اگر چہ حبشی غلام کو امیر بنادیا جائے اس کی بھی اتباع کرو۔ (الصحیح للمسلم:۳۴۲۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر امیر کی اتباع کرنا ضروری ہے، بہ ظاہر یہ آیت قرآن سے متعارض معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مطلق نہیں، مقید ہے یعنی ''ہر امیر کی اتباع کرو اُس کے دائرے میں'' مطلب یہ ہے کہ کوئی امیر ہو، کوئی عہدہ دار ہو، کوئی صدر ہو، کسی مدرسے کا ذمے دار ہو، کسی کالج کا ذمے دار ہو، تو ان کی امارت اُن کی انجمن تک، اُن کی صدارت اُن کے مدرسے تک، یا مسجد تک یا اسکول وکالج تک محدود ہوگی اور یہ ضروری بھی ہے؛ اس لیے کہ اگر ان کی اتباع نہ کی گئی تو سارا انظام درہم برہم ہو جائے گا، نہ کوئی ادارہ چل پائے گا، نہ کوئی انجمن ترقی کرے گی، نہ کوئی مدرسہ یا اسکول یا کالج چل سکے گی۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کالج یا اسکول کا ذمے دار ہو، یا کسی ادارے کا بانی وسر پرست ہو یا کسی جامعہ کا استاذ ہو، تو قرآن وحدیث کے سلسلے میں بھی اُسی کی اتباع کی جائے گی اور اس کو مقتدائیت حاصل ہو جائے گی، ہر گز نہیں! بل کہ اس کا معیار تو وہ ہے جو ابھی عرض کیا گیا کہ جو اہلِ ذکر و اہلِ انابت میں سے ہو، وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ مقتدیٰ بنے۔

گویا قرآن جس اتباع کی بات کر رہا ہے، وہ اللہ کے اور دین کے راستے میں چلنے کے سلسلے میں اتباع ہے، خدا تک رسائی پانے کے سلسلے میں اتباع ہے، وہ اتباع

جس سے خدا مل جائے، جنت مل جائے، اُس کے لیے جب تک اللہ والے کی اتباع نہ ہوگی، خدا کبھی نہیں مل سکتا اور حدیث جس اتباع کا ذکر کر رہی ہے اس سے مراد مختلف انتظامی امور میں اتباع؛ لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔

دنیا دار کی اتباع سے بچو-ایک واقعہ

مقتدائیت کا یہ معیار سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آج ہر کسی کی لوگ اتباع کر لیتے ہیں اور بعض وقت اسی کی وجہ سے گمراہی میں پڑ جاتے ہیں، حتی کہ دنیا دار قسم کے لوگوں کی بھی اتباع کر لیتے ہیں، اس پر ایک قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے ایک عجیب خواب دیکھا اور اپنے شیخ سے جا کر بتایا؛ تا کہ اس کی تعبیر معلوم ہو جائے، اس نے کہا کہ حضرت! میں نے آج خواب میں دیکھا کہ میرے سامنے دو برتن ہیں اور ایک برتن میں شہد ہے اور ایک برتن میں نجاست ہے، پھر دیکھا کہ آپ کے ہاتھ شہد والے برتن میں ڈوبے ہوئے ہیں اور میرے ہاتھ نجاست والے برتن میں پڑے ہوئے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ صاحب کہنے لگے کہ اس کی تعبیر تو واضح ہے کہ ہمارے ہاتھ شہد میں ہیں یعنی دین میں ڈوبے ہوئے ہیں، اس میں ہمارے دین دار ہونے کی طرف اشارہ ہے اور تمھارے ہاتھ نجاست میں ڈوبے ہوئے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا دار ہو، دنیا کی مثال پاخانے کی طرح ہے؛ اس لیے تمھارے ہاتھ پاخانے میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے اور ہمارے ہاتھ شہد میں ڈوبے ہوئے نظر آئے تھے، اس مرید نے کہا: حضرت! آپ کی تعبیر تو صحیح ہے؛ مگر ابھی خواب پورا نہیں ہوا، پورا خواب سن لیجیے کہ میں نے آگے خواب میں یہ بھی دیکھا کہ آپ کی شہد میں ڈوبی ہوئی اُنگلیاں میں چاٹ رہا ہوں اور میری نجاست میں ڈوبی ہوئی انگلیاں آپ چاٹ رہے ہیں، یہ سن کر وہ شیخ غصے میں آ گیا اور اُس کو بھگا دیا، حضرت

تھانوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: خواب کے اس آخری حصے کی تعبیر میں دیتا ہوں، وہ یہ کہ اُس مرید کے ہاتھ واقعی دنیا میں ڈوبے تھے؛ مگر وہ دین لینے کے لیے شیخ کے پاس آیا تھا؛ اس لیے شیخ کے ہاتھ سے شہد چاٹ رہا تھا؛ مگر وہ پیر مرید کو دین پہنچانے کے بجائے، اُس سے دنیا حاصل کرتا تھا؛ اس لیے وہ اس مرید کی نجاست سے آلودہ اُنگلیاں چاٹ رہا تھا۔

افسوس کہ یہ حال ہے آج مقتداؤں کا؛ اس لیے دنیا داروں سے بچنا چاہیے؛ اس لیے کہ دنیادار کی اتباع سے دنیا ملتی ہے اور دین دار کی اتباع سے اللہ ملتا ہے۔

کیا آج اللہ والے نہیں ہیں؟

فرمایا: آج کل لوگ یوں کہتے ہیں کہ اللہ والے آج کہاں ہیں ؟ جنید بغدادی رحمہ اللہ کہاں سے آئیں گے؟ شبلی رحمہ اللہ اور بایزید بسطامی رحمہ اللہ کہاں سے آئیں گے کہ ہم ان سے فیض حاصل کریں؟ فرمایا کہ یہ شیطانی دھوکہ ہے؛ بل کہ ایسا کہنے والا ایک آیت کا در پردہ منکر ہے، اللہ نے فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صادقین کی صحبت اختیار کرو۔)

اس آیت میں لوگوں کو ’’صادقین‘‘ کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نیک و متقی لوگ رہیں گے، یہ ایسا ہی ہے، جیسے باپ اپنے بچوں سے یوں کہے کہ بچو! روزانہ دودھ پیا کرو، اب اگر باپ بچوں کو دودھ کا انتظام نہ کرے، تو وہ باپ ظالم ہوگا، اسی طرح اللہ تعالیٰ یہ کہہ رہے ہیں کہ متقیوں کے ساتھ رہو، تو ہر زمانے میں متقیوں کو، اللہ والوں کو پیدا کرنا اس کا کام ہے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ آج اللہ والے نہیں ہیں، تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ آج

قرآن کی اس آیت پر عمل نہیں ہوسکتا؛ اس لیے ایسا آدمی قرآن کی ایک آیت کا گویا منکر ہے؛ لہٰذا ایسا سوچنا غلط ہے، بل کہ آج بھی اللہ والے ہیں، ان کو تلاش کر کے اپنی اصلاح کریں، یہ الگ بات ہے کہ ہر زمانے کے اعتبار سے اللہ والے الگ الگ صلاحیتوں کو لے کر آتے ہیں، جو ان کے زمانے کی ضرورت ہوتی ہے، کسی زمانے میں حضرت ابوبکر وعمر بن الخطاب وعثمان وعلی وعمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم کی ضرورت تھی، تو کسی زمانے میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابن ابی لیلیٰ وامام اوزاعی رحمہم اللہ جیسے حضرات کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں امام بخاری، امام مسلم، امام عبدالرزاق، امام ترمذی، امام ابوداؤد، ابن الجوزی، ابن الصلاح، ابن حجر رحمہم اللہ جیسوں کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں حسن بصری، شیخ عبد القادر الجیلانی، حضرت جنید وحضرت شبلی، بایزید بسطامی رحمہم اللہ وغیرہ کی ضرورت تھی، کسی زمانے میں رازی وغزالی وابن رشد رحمہم اللہ کی ضرورت تھی، تو کسی وقت میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، خلیل احمد سہارنپوری، اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ کی ضرورت تھی، تو ان کو پیدا کیا۔

اللہ والے کہاں ملیں گے؟

ایک اہم بات سن لو کہ بہت سے اللہ والے ہمارے بغل میں ہی رہتے ہیں؛ مگر ہم اُن کو نہیں پہچانتے، ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ہم نہیں جانتے، آپ نے سنا ہوگا کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کا جب آخری وقت آیا، تو اُن کی اولاد میں حکومت وسلطنت کے بارے میں اختلاف ہوا، ان کی اولاد میں ایک تو دارا شکوہ تھا، دوسرے اورنگ زیب تھے، دونوں حکومت چاہتے تھے، اورنگ زیب نیک انسان تھے، وہ حکومت سے دین کو تقویت دینا چاہتے تھے اور دارا شکوہ غلط کار صوفیوں

میں رہنے کی وجہ سے آزاد منش ہو گیا تھا، ایک مرتبہ دہلی میں ایک بزرگ آئے اور ان کی شہرت ہوئی کہ ایک مستجاب الدعوات بزرگ تشریف لائے ہیں، ان سے حکومت کے لیے دعا کروانے پہلے دارہ شکوہ گئے اور ان بزرگ صاحب سے ملاقات کی، اُنھوں نے شہزادے کا استقبال کیا اور کہا کہ میری گدّی پر بیٹھ جاؤ؛ مگر دارہ شکوہ نے بہ راہِ ادب انکار کر دیا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا اور باتیں ہوتی رہیں، پھر رخصت کے وقت دارہ شکوہ نے کہا کہ حضرت! دعا کیجیے کہ میرے باپ کی حکومت مجھے مل جائے، وہ بزرگ کہنے لگے کہ ہم نے تو اپنی گدّی پر بٹھا کر آپ کو حکومت دینی چاہی مگر آپ نے انکار کر دیا، اب حکومت نہیں ملے گی، وہ افسوس کرتے ہوئے واپس ہو گئے، کچھ دیر بعد اورنگ زیب بھی ان سے دعا کرانے حاضر ہوئے، بزرگ صاحب نے اُن کو بھی گدی پر بیٹھنے کا حکم فرمایا، پہلے تو اورنگ زیب نے بھی بہ راہِ ادب انکار کیا، پھر جب ان بزرگ نے حکم دیا تو ان کی گدی پر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے کہ ’’اَلْأَمْرُ فَوْقَ الْأَدَبِ‘‘ پھر اورنگ زیب بھی مختلف امور پر گفتگو فرماتے رہے، پھر آخر میں عرض کیا کہ حضرت! دعا کیجیے کہ میرے باپ کا تخت وتاج مجھے مل جائے، انھوں نے کہا کہ تخت پر تو ہم نے اللہ کے حکم سے آپ کو بٹھا دیا؛ مگر تاج مَیں نہیں دے سکتا، بل کہ آپ کا غلام جو آپ کو روزانہ وضو کراتا ہے، وہ اگر آپ کے سر پر عمامہ رکھ دے، تو تاج بھی مل جائے گا، اورنگ زیب نے تعجب سے کہا: میرا غلام جو میری جوتیاں سیدھی کرتا ہے! کیا وہ اتنا بڑا اللہ والا ہے؟! گھر گئے اور وضو کے بعد غلام کو حکم دیا کہ عمامہ پہنا دو، غلام نے کہا: حضور! میں آپ کے سر پر کیسے رکھ سکتا ہوں؟! گستاخی ہوگی، اورنگ زیب نے کہا: میرا حکم ہے رکھ دو، اُس نے رکھ تو دیا؛ مگر سمجھ گیا کہ میرا راز فاش ہو گیا ہے، اُس کے

بعد وہ وہاں سے غائب ہو گیا، دیکھیے! جسے غلام اور نوکر سمجھا جاتا رہا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا کتنا بڑا مقام تھا؛ لہٰذا آج بھی اللہ والے موجود ہیں؛ مگر پہچاننے والی آنکھ چاہیے۔

اوصافِ اہل اللہ

فرمایا کہ آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک کرامت کا ظہور نہ ہو، وہ اللہ والا نہیں ہوسکتا، اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ وہ سنتوں کا کتنا پابند ہے؟ اللہ سے کتنا ڈرتا ہے؟ اگر چہ کرامت ظاہر نہ ہو، اُس کی شہرت نہ ہو، ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی بزرگ کو معلوم ہوا کہ ان کے شہر میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، وہ بزرگ ملاقات وزیارت کے لیے تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو وہ مہمان بزرگ وضو کر رہے تھے، کچھ دیر وہ کھڑے ہو کر ان کا وضو دیکھتے رہے، پھر واپس آ گئے، ملاقات نہیں کی، شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ان بزرگ سے ملنے گئے تھے؛ مگر ملاقات کیے بغیر واپس آ گئے، کیا بات ہے؟ فرمایا: میں اُن کے وضو کے طریقے کو دیکھ رہا تھا، جو سنت کے خلاف تھا، جسے وضو کی سنتیں ہی معلوم نہ ہوں، وہ اللہ والا کیسے ہوسکتا ہے؟!

اگر ہدایت نہ پانا چاہے؟

کوئی ہدایت نہ پانا چاہے تو نبی کا معجزہ بھی کام نہ آئے گا، جیسا کہ مولانا رومی رحمہ اللہ نے ”مثنوی“ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اگر آپ بتا دیں گے تو میں ایمان لے آؤں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں بتاؤں کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے ہاتھ کی

چیز خود بتادے کہ میں کون ہوں، اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے کان کے قریب لے جاؤ، وہ جب اپنے کانوں کے قریب لے گیا، تو ہاتھ کی کنکریوں سے آواز آرہی تھی "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" لیکن اس پر بھی اسے ہدایت نہیں ملی، اس نے ہاتھ کی کنکریوں کو پھینک دیا اور کہنے لگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جادو انسانوں ہی پر نہیں، کنکریوں پر بھی چلتا ہے۔

دیکھیے! ابوجہل ہدایت پانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ بھی اس کے کام نہ آیا۔

نوٹ: مثنوی شریف کے علاوہ کہیں کتبِ حدیث میں اس واقعے کا ذکر نہیں ہے۔

ایمان کی ٹھنڈک کیسے حاصل ہو؟

فرمایا: مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ جدہ میں کہیں جانے کے لیے ایک مرتبہ کار میں بیٹھے، خوب گرمی تھی اور لو چل رہی تھی، حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اے، سی چلادو، اے، سی (AC) چلادیا گیا؛ لیکن کار میں ٹھنڈک نہیں آئی، تو حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے؟ تمھارا ایرکنڈیشنیر کچھ ناقص ہے؟ ٹھنڈک کیوں نہیں آرہی ہے؟ تو ڈرائیور نے کہا کہ شاید کار کا کوئی شیشہ کھلا ہوا ہے، جس سے باہر کی گرمی اندر آرہی ہے، دیکھا تو ایک طرف کا شیشہ کھلا ہوا تھا، جلدی سے شیشہ بند کردیا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں پوری کار ٹھنڈی ہوگئی، گرمی اور لو سے حفاظت ہوگئی، اس پر حضرت والا رحمہ اللہ نے ایک عجیب بات فرمائی، جو قابل وجد ہے، فرمایا کہ اے، سی چالو ہونے کے باوجود کار میں ٹھنڈک اس لیے نہیں آئی کہ اس کا ایک شیشہ ذرا سا کھلا ہوا تھا، اسی طرح اگر آنکھ

کان، زبان وغیرہ کا شیشہ کھلا ہوا ہو، تو دل میں ایمان کی ٹھنڈک داخل نہیں ہوسکتی؛ اس لیے اگر ایمان کی ٹھنڈک چاہتے ہو، تو آنکھ کان وغیرہ پر پابندی لگانا ہوگا اور ان کو بند رکھنا ہوگا۔

طہارت کیا ہے؟

حدیث میں ہے: " اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ" (پاکی آدھا ایمان ہے)
(الصحیح للمسلم:۳۲۸، الجامع للترمذي :۳۴۳۹)
اور ایک حدیث میں ہے:"لَا تُقْبَلُ صَلوٰةٌ بِغَيْرِ طُهُوْرٍ"(الجامع للترمذي :۱) (بغیر پاکی صفائی کے نماز قبول نہیں ہوتی) اب سوال یہ ہے کہ طہارت کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ سمجھو کہ طہارت کے متعلق جو فرمایا کہ طہارت نصف ایمان ہے، دراصل اس میں جو لفظِ "شطر" آیا ہے، اس میں علما کا اختلاف ہے کہ "شطر" کے کیا معنی ہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ "شطر" کے معنی آدھا اور نصف کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "شطر" کے معنی حصے کے ہیں، اور یہ دونوں معنے صحیح ہیں، اگر "شطر" کو حصے کے معنی میں لیا جائے تو اس حدیث کا معنی ہوگا کہ پاکی صفائی ایمان کا ایک حصہ ہے اور ایک جزو ہے، جو بہت ہی اہم اور عظیم ہے اور اگر اس کو نصف کے معنی میں لیا جائے تو اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکی صفائی آدھا ایمان ہے یعنی اس کا اتنا بڑا مقام ہے کہ نماز، روزہ، زکوۃ، حج، ذکر، درس وتدریس سب ایک طرف اور پاکی صفائی دوسری طرف یعنی ایمان کے دو حصوں میں سے ایک حصے میں ساری عبادات اور تمام احکامات ہیں اور اس میں وہ سب کچھ ہے جو کہ اسلام کا مقتضی ہے اور دوسرے حصے میں صرف پاکی صفائی، تنظیف وتطہیر ہے، اتنا بڑا مقام ہے طہارت کا۔

طہارت کے چار اقسام ہیں

اس پر بہ ظاہر ایک شبہ ہوتا ہے کہ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ تمام عبادات وسارے احکامات ایک طرف ہوں اور صرف پاکی وطہارت ایک طرف؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم طہارت کا بہت ادنیٰ ومحدود مفہوم مراد لیتے ہیں اور اگر اس کا وہ وسیع مفہوم مراد لیا جائے، جو اسلام پیش کرتا ہے تو یہ شبہ خود کافور ہو جائے گا۔ علما فرماتے ہیں کہ پاکی وطہارت کی چار قسمیں ہیں:

۱- اپنے ظاہر کو پاک کرنا، جس میں کپڑے، بدن وغیرہ کی پاکی داخل ہے۔ یہ سب سے ادنیٰ درجے کی پاکی ہے۔

۲- اپنے ظاہری اعضا کو گناہوں سے پاک کرنا؛ کیوں کہ گناہ بھی ایک نجاست ہے۔ جیسے آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پیر وغیرہ کو ان سے ہونے والے گناہوں سے بچایا جائے۔

۳- اپنے باطن اور دل کو باطنی گناہوں سے پاک کرنا۔ جیسے حسد، بغض، تکبر، انانیت، کینہ وغیرہ سے پاکی حاصل کرنا۔

۴- اور جو سب سے اعلیٰ وارفع ہے، وہ یہ کہ اپنے دل کو ماسوی اللہ سے پاک وصاف رکھے اور اپنے دل سے تمام فانی چیزوں کی محبت کو نکال دے اور اس دل کو صرف اللہ کی محبت سے مزین رکھے۔

اس تفصیل کو سامنے رکھ کر سوچو کہ کیا یہ سب مل کر آدھا ایمان نہیں ہو گیا؟ اور کیا ان سب پر آدھے ایمان ہونے کی بات صادق نہیں آتی؟ اشکال اس لیے ہوتا ہے کہ ہم لوگ عام طور پر پاکی کو صرف جسم اور کپڑوں اور بعض ظاہری چیزوں کی پاکی تک محدود سمجھتے ہیں، حال آں کہ اس کی اور بھی تین قسمیں ہیں۔

سوئے حافظہ کا علاج

امام شافعی رحمہ اللہ ایک مرتبہ اپنے استاذ امام وکیع رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ، امام وکیع رحمہ اللہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ہیں اور امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ ہیں، بہ ہر حال امام شافعی رحمہ اللہ نے امام وکیع رحمہ اللہ سے شکایت کی کہ بعض دفعہ کوئی چیز یاد کرتا ہوں تو یاد نہیں رہتی، بھول جاتا ہوں، اس کا کوئی علاج بتائیے، امام وکیع رحمہ اللہ نے فرمایا کہ گناہ چھوڑ دو، علمِ الٰہی تمھیں حاصل ہو جائے گا؛ کیوں کہ علمِ دین دراصل علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی گنہ گار کو نہیں دیا جاتا۔

اس واقعے کو امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے:

شَكَوْتُ إِلىٰ وَكِيْعٍ سُوْءَ حِفْظِيْ
فَأَوْصَانِيْ إِلىٰ تَرْكِ الْمَعَاصِيْ
فَإِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِنْ إِلٰهٖ
وَ نُوْرَ اللّٰهِ لَا يُعْطىٰ لِعَاصٍ

میں آپ طلبائے کرام کو دعوتِ فکر دیتا ہوں، آپ لوگ سوچیں، ذرا غور کریں کہ امام شافعی رحمہ اللہ جیسے جلیل القدر امام سے بھی کوئی گناہ ہوتا تھا؟ کیا وہ گناہ کیا کرتے تھے؟ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ معصوم تھے، یہ عصمت تو انبیاء کی شان ہے اور بڑے سے بڑا امام بھی گناہ کر سکتا ہے؛ مگر ان کے جلیل القدر مقام کو دیکھ کر دل یہ کہتا ہے کہ وہ اگر چہ معصوم نہیں تھے، کبھی کبھی ہو سکتا ہے کہ گناہ صادر ہو جائے؛ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ گنہ گار اور دن رات گناہوں میں ملوث تھے، اس کے باوجود امام وکیع رحمہ اللہ نے ان کو یہ نصیحت کی کہ گناہ چھوڑ دو، سوال یہ ہے کہ جب امام

شافعی رحمہ اللہ گنہ گار نہیں تھے، تو پھر امام وکیع رحمہ اللہ نے ان کو یہ نصیحت کیوں کی؟ اس کا جواب یہ کہ امام وکیع رحمہ اللہ کی اس تلقین سے مراد یہ نہیں کہ گناہ چھوڑ دو؛ کیوں کہ وہ تو پہلے سے چھوڑے ہوئے ہیں؛ بل کہ مراد یہ ہے کہ خلافِ اولیٰ کام بھی نہ کرو، جب امام وکیع رحمہ اللہ یہ کہہ رہے ہیں کہ خلافِ اولیٰ کام بھی ترک کردو، تو ذرا اندازہ لگائیے کہ گناہ کا کام کرنے والے کو کس طرح علم حاصل ہوسکتا ہے؟ اس لیے بھائیو! گناہ سے بچنا اور اس سے پرہیز کرنا چاہیے، تاکہ علمِ الٰہی دل میں اُتر جائے، ورنہ اگر نورِ الٰہی دل میں پیدا نہ ہو تو جینے کا کیا مزہ؟ اس سے تو موت کئی گناہ بہتر ہے، دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو اپنا غلام بنائے۔ آمین۔

مسیح الامت رحمہ اللہ کا تعلیمی دور

ہمارے حضرت مسیح الامت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند میں میرے ساتھ کمرے میں دو ساتھی اور تھے اور ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور دو سال تک ہم سب ایک ہی کمرے میں تھے، مگر میں نے کبھی بھی ان سے مل کر بات چیت اور غپ شپ نہیں کی؛ حتیٰ کہ مجھے اس طویل عرصے میں ان کا نام تک معلوم کرنے کا موقعہ نہیں ملا اور فرمایا کرتے تھے کہ میں اس دور میں درس گاہ، حجرہ اور مسجد کے علاوہ کسی جگہ نہیں گیا، حتیٰ کہ دفتر بھی نہیں گیا۔

بھائیو! سنا آپ نے کہ کس قدر عقل کو حیران کرنے والا واقعہ ہے کہ دو سال ایک ہی کمرے میں رہتے ہوئے گزر گئے، مگر حضرت والا رحمہ اللہ کو اپنے کمرے کے ساتھیوں کا نام تک معلوم نہ ہوسکا، ان سے بات چیت اور ایران توران کی گفتگو تو دور کی بات ہے، بس حضرت کا معمول یہ تھا کہ کمرے سے نکلے، تو درسگاہ پہنچے، پھر درسگاہ سے کمرہ پہنچ گئے اور مطالعہ شروع کردیا اور اسباق کی فکر

میں لگ گئے اور جب نماز کا وقت ہوا تو مسجد چلے گئے، کسی سے بات چیت نہیں۔ یہ درحقیقت طالبِ علم کے طالبِ علم ہونے کی شان ہے، تب جا کر علم اپنا تھوڑا سا حصہ دیتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ سے اللہ نے دنیا میں ایک بڑا فیض کا سلسلہ جاری فرما دیا اور آپ کے خوشہ چینوں میں ہزاروں علما و صوفیا آج بھی علم کا دریا بہا رہے ہیں۔

زبان تو ذکر کے لیے ہے

ایک بزرگ نے بڑی عبرت خیز بات فرمائی ہے کہ جب بچہ رحم مادر میں ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی پرورش کرتے ہیں، اسے رزق پہنچاتے ہیں، کس طرح؟ اس طرح کہ عورت کو جو ماہانہ خون آتا ہے، اسی خون کو اللہ تعالیٰ اس کی غذا بنا دیتے ہیں؛ لیکن بچے کو یہ رزق اس کے منہ کے ذریعے نہیں؛ بل کہ اس کی ناف سے دیا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ایسا انتظام کیوں کیا ہے؟ جب کہ اس کے پاس منہ بھی ہوتا ہے؛ مگر منہ کے بجائے ناف سے کیوں اس کو غذا پہنچائی جاتی ہے؟

ان بزرگ نے فرمایا کہ بچے کو ناف کے ذریعہ رزق پہنچانا اور زبان سے نہ پہنچانا، اس میں یہ حکمت رکھی ہے کہ بچے کو جو غذا وہاں دی جاتی ہے، وہ دراصل وہ خون ہے جو عورت کو ماہوار نکلتا ہے، اب رحم میں بچہ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ اسی خون کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اس کی غذا بنا دیتے ہیں اور یہ سب کو معلوم ہے کہ خون ناپاک اور گندہ ہوتا ہے، اگر اس کو وہ خون منہ سے دیا جاتا، تو زبان ناپاک اور گندی ہو جاتی اور زبان کو اللہ نے اپنے ذکر کے لیے بنایا ہے، تو پہلے ہی سے اللہ نے اس کی اس طرح حفاظت فرمائی کہ اس کو رحم مادر میں بھی ناپاک خون سے محفوظ رکھا۔

اس وجہ سے جس زبان سے اللہ کا ذکر ہو، اللہ کا نام لیا جاتا ہو وہ زبان گندی نہ ہو جائے، وہ فرماتے ہیں کہ اس لیے اللہ نے اس کے رزق کا انتظام زبان کے بجائے دوسری جگہ یعنی ناف سے کیا۔

میں کہتا ہوں کہ اب ذرا غور کیجیے کہ آج زبان کو کتنا گندہ کیا جاتا ہے؟ ایک طرف اس سے گالیاں دی جاتی ہے اور دوسری طرف اسی زبان سے قرآن پڑھا جاتا ہے، ایک طرف اس سے چغلی کھائی جاتی ہے اور دوسری جانب اسی سے حدیثِ پاک پڑھی جاتی ہے، ایک طرف اس سے غیبتیں کی جاتی ہیں پھر اسی زبان سے اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، یہ کتنی بے ادبی کی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے تو رحم مادر میں بھی ہماری زبان کی ناپاک خون سے حفاظت کی اور ہم یہاں آ کر اس کو ہر طرح کی گندگی سے آلودہ کر لیتے ہیں۔

ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر میں سو بار بھی اپنی زبان کو مشک و عنبر سے دھوؤں، تب بھی اس زبان سے اللہ کا نام لینا کمالِ بے ادبی ہے، دیکھا بھائی! اللہ کے نام کا کتنا احترام ہے ان کے نزدیک؟!! اور ایک ہم ہیں کہ اپنی زبانوں کو گندہ کرتے رہتے ہیں، پھر اسی زبان سے اللہ کا نام بھی لیتے ہیں، کیا اللہ کا نام اتنا آسان ہے کہ ہم اپنی گندی زبان سے اس کو لیں؟ اللہ جیسا پاکیزہ نام، اور یہ بے ادبی!! جب ادنیٰ سے ادنیٰ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے تو پھر اللہ کے نام کا کتنا اور کیسا احترام ہونا چاہیے تھا؟!!

مائے مستعمل ناپاک کیوں ہے؟

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے اور پورے آداب کی رعایت کے ساتھ کرتا ہے، تو اس کے تمام اعضا سے؛ حتی کہ اس کے ناخنوں کے پوروں سے بھی

گناہ جھڑتے اور نکل جاتے ہیں۔ (الجامع للترمذي:٢)

معلوم ہوا کہ وضو کے اعضا سے وضو کرنے والے کے گناہ جھڑتے ہیں اور یہ اس پانی کے ساتھ نکلتے ہیں، جو وہ وضو میں استعمال کرتا ہے، یہ کتنی بڑی فضیلت ہے وضو کی! اور مومن کے لیے کس قدر سامانِ تسلی ہے اس میں!

اب یہیں سے ایک فقہی مسئلہ بھی حل کرتے چلیں، وہ یہ کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ماءِ مستعمل کو اپنی ایک روایت میں ناپاک قرار دیا ہے، اس حدیث سے اس مسئلے کی تائید ہوتی ہے؛ کیوں کہ گناہ ایک باطنی گندگی ہے، جب وہ گندگی وضو کے پانی کے ساتھ مل جاتی ہے، تو اس پانی کو بھی ناپاک کر دیتی ہے۔

ایک بہت بڑے عالم علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ جو کہ شافعی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ امام اعظم رحمہ اللہ کو لوگوں کے حالات منکشف ہو جایا کرتے تھے اور جب لوگ وضو کرتے تو ان کے اعضا سے نکلا ہوا پانی، جب گرتا تھا تو اس میں امام صاحب رحمہ اللہ کو گناہ کے جراثیم نظر آجاتے تھے؛ اس لیے امام صاحب رحمہ اللہ نے اس مستعمل پانی کو نجاستِ غلیظہ کہا اور امام صاحب رحمہ اللہ سے ایک اور روایت یہ ہے کہ یہ مستعمل پانی نجاستِ خفیفہ ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وضو کا جو پانی اعضا سے نکلتا ہے گویا کہ وہ ناپاک ہے۔

اس فقہی مسئلے سے ایک سلوک کا مسئلہ عرض کرتا ہوں کہ جب امام صاحب رحمہ اللہ گناہ سے ملے ہوئے پانی کو ناپاک قرار دے رہے ہیں، تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک گناہ بڑی ناپاک چیز ہے اور اس کے ناپاک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث میں ہے کہ جب کوئی جھوٹ بولتا ہے، تو اس کے پاس سے فرشتے بھاگ جاتے ہیں؛ کیوں کہ اس کے جھوٹ سے ان

کو بدبو آتی ہے۔ (الجامع للترمذي:۱۸۹۵)

بھائیو! اس لیے گناہوں سے بے انتہا اجتناب ضروری ہے؛ تاکہ ہم گندگی و آلودگی سے محفوظ رہیں۔

سالک کا کام کیا ہونا چاہیے؟

مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ راہِ سلوک کے مسافر کو تین کاموں میں سے ایک کام ضرور کرنا چاہیے: پہلا اور سب سے اہم کام یہ کہ اخلاقِ رذیلہ کو یکسر اپنے قلب سے اُکھاڑ پھینکے، جس طرح حضرت علی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے درِ خیبر کو اُکھاڑ کر پھینک دیا تھا، جس سے خیبر کا زبردست قلعہ فتح ہو گیا تھا، اسی طرح باطنی فتوحات کے لیے ضروری ہے کہ رذائل اخلاق کو دل سے بہ یک وقت ختم کر کے رکھ دے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باطنی فتوحات کے لیے قلب کا اخلاقِ رذیلہ سے پاک کرنا ضروری ہے۔

مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی سالک پست ہمتی کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے، تو دوسرا کام سالک کا یہ ہے کہ وہ رذائل کو ختم کرنے کی کوشش میں لگ جائے، یہ کوشش میں لگنا ہی فتوحاتِ باطنیہ قرار پائے گا۔ جیسے خیبر کے موقعے پر صدیق اکبر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ و عمر فاروق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ نے کیا کہ ان کے ہاتھ سے درِ خیبر اُکھڑ نہ سکا؛ مگر وہ برابر اس کے اُکھاڑنے کی کوشش میں تھے اور اسی لیے ان کو شریکِ جہاد مانا گیا اسی طرح جو رذائل اخلاق کے اُکھاڑنے اور ان کو ختم کرنے میں کوشاں ہوگا، وہ باطنی جہاد میں شامل اور فتح میں شریک قرار دیا جائے گا، یہاں مراد جہادِ اکبر ہے۔ جیسے غزوہ، جہادِ اصغر ہے۔

مولانا روم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ جو سالک اتنا کمزور وضعیف ہو اور پست ہمت ہو کہ یہ کام بھی نہ کر سکے، تو ایسے سالک کے لیے ایک تیسرا کام ہے، مولانا

روم رَحِمَہُ اللہُ نے ضعیف و پست ہمت سالکین کے لیے یہ کام تجویز فرما کر ان کو بھی جہاد میں حصہ دار بنا دیا، وہ یہ کہ کسی کامل کی صحبت وخدمت میں رہنے کی زحمت گوارا کرے، مولانا رَحِمَہُ اللہُ نے اس کو عجیب تمثیل سے واضح کیا ہے کہ جیسے کانٹا کہ اس کو اگر الگ نہ کیا جا سکتا ہو، تو اس کو پھولوں کے ساتھ ملائے رکھتے ہیں اور یہ کانٹا بھی محبوب ہو جاتا ہے اور جب پھول چننے والے اور پھول کو آنکھوں اور دل سے لگانے والے، پھول چنتے اور لیتے ہیں، تو اس کانٹے کو بھی لیتے ہیں اور آنکھوں اور دل سے لگاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی طرح جو سالک اپنے رذائل کو ختم نہ کر سکے اور نہ اس اس کی کوشش ہی کر سکے تو کم از کم کسی کامل و محبوب کی صحبت وخدمت میں رہ جائے، جس سے اتنا فائدہ تو ہوگا کہ محبوب کے ساتھ یہ بھی محبوب ہو جائے گا، اگر چہ کہ مراتب میں فرق وتفاوت ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، تاہم یہ بھی فائدۂ عظیمہ ہے۔

جیسی زندگی ویسی موت

فرمایا کہ اللہ کا قانون یہی ہے کہ جیسی زندگی ہوتی ہے، ویسی ہی موت آتی ہے؛ اسی لیے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنا چاہیے اور ہرگز نہ مرو؛ مگر مسلمان ہو کر۔) (آل عمران: ۱۰۲)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے کی حالت تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے، پھر کیوں کر اسلام کی حالت میں مرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ مفسرین نے اس کا جواب دیا ہے کہ اسلام پر مرنا تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے؛ مگر اسلام پر جینا تو ہمارے اختیار میں ہے، جو اسلام پر جیتا رہے گا، وہ اسلام پر مرے گا، جو ذکر پر جیے گا، وہ ذکر

پر مرے گا، جو دنیا پر جیے گا، وہ دنیا پر ہی مرے گا۔

حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کی وفات کا واقعہ

فرمایا کہ مرشدی حضرت مسیح الامت شاہ مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ کی وفات کا عجیب واقعہ ہے، حضرت رحمہ اللہ کی وفات سے ایک ماہ پہلے بندہ ملاقات واستفادے کے لیے گیا تھا اور کچھ ایام حضرت والا رحمہ اللہ کی خدمت میں گزار کر آیا تھا، اس وقت حضرت رحمہ اللہ کو نہایت ہی ضعف ونقاہت تھی، مصافحے کے لیے ہاتھ اُٹھانے کی بھی طاقت نہیں تھی، میرے واپس آنے کے پندرہ دن بعد حضرت والا رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا، ہوا یہ کہ جس رات حضرت والا کا انتقال ہوا، اُس وقت وہاں میرے ساتھی مولانا عنایت اللہ لندنی موجود تھے، وہی حضرت کے خادم بھی تھے، مجھے اُن کی یہ روایت پہنچی کہ رات وہ سو چکے تھے، حضرت والا رحمہ اللہ بھی سو چکے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ رات میں مجھے اچانک محسوس ہوا کہ ذکر کی آواز آرہی ہے، اُٹھ کر دیکھا تو حضرت رحمہ اللہ خود بہ خود اٹھ کر بیٹھے ہیں، ذکر بالجہر میں مشغول ہیں، جب کہ ہاتھ اُٹھانا بھی مشکل تھا، خود اُٹھ کر بیٹھنا تو خارج از سوال تھا، یہ حضرات پریشان ہوکر حضرت رحمہ اللہ کو پکارنے لگے اور اپنی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی؛ مگر متوجہ نہ ہوئے، گویا اِدھر کا خیال ہی نہیں تھا، تقریباً ایک گھنٹہ اسی طرح ذکر جاری رہا اور اسی حالت میں ذکر کرتے کرتے ہی وصال ہوگیا۔

بھائیو! جیسی زندگی ہوتی ہے ویسی ہی موت آتی ہے، جس کی اللہ کی یاد میں زندگی گزرتی ہے، اس کی موت بھی اسی کی یاد میں آتی ہے، یہ اللہ والے ہمیشہ اللہ کی یاد میں ہوتے ہیں، تو موت بھی اللہ ہی کی یاد میں آتی ہے۔

ایک بزرگ کی موت کا واقعہ

اسی پر ایک اور واقعہ یاد آیا، حضرت اقدس مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کے ایک خلیفہ قادر معظم صاحب رحمہ اللہ، جو ''فیض العلوم، حیدرآباد'' میں مدرس تھے، ان کی موت کا واقعہ عجیب ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ان کے علاقے کے حالات خراب تھے، کرفیو تھا، دو چار دن بعد کرفیو میں ڈھیل دی گئی، تو قادر معظم صاحب رحمہ اللہ طلبہ کو دیکھنے مدرسہ جارہے تھے، درمیان میں کچھ غنڈوں نے گھیر لیا اور قتل کرنے کے درپے ہوگئے، تو حضرت رحمہ اللہ نے فوراً رومال بچھا کر نماز پڑھنا شروع کردیا، جب سجدے میں گئے تو دشمنوں نے قتل کردیا اور روح قبض ہوگئی۔

دیکھیے! موت کے وقت اللہ کی یاد آجانا دلیل ہے کہ زندگی بھی اللہ کی یاد میں گزری ہے، اگر اللہ کی یاد میں زندگی نہ گزاری ہوتی، تو موت بھی اللہ کی یاد میں نہ آتی۔

شقاوت و بدبختی کی علامت

علامہ قشیری رحمہ اللہ نے'' الرسالۃ '' میں محمد بن الفضل البلخی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے ابوعثمان الحیری نے پوچھا کہ بدبختی کی علامت کیا ہے؟ تو فرمایا کہ تین باتیں شقاوت و بدبختی کی علامت ہیں: ایک یہ کہ علم دیا جائے؛ مگر عمل سے محروم کردیا جائے، دوسرے یہ کہ عمل کی توفیق دی جائے؛ مگر اخلاص نصیب نہ ہو، تیسرے یہ کہ اولیا و صالحین کی صحبت ملے؛ مگر ان کا احترام نصیب نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ سالک کو مذکورہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیے اور علما حضرات کو بھی اس پر غور کرنا چاہیے، کوئی عالم ہوجائے؛ مگر عمل نہ کرے یہ بھی بدبختی ہے اور کوئی عمل تو کرے؛ مگر مقصد و نیت غیرِ خدا ہو، اخلاص حاصل نہ ہو، تو یہ بھی بدبختی ہے اور صالحین

کی صحبت و معیت نصیب ہو اور ان کی قدر کر کے ان سے کچھ حاصل نہ کرے، تو یہ بھی بڑی ہی محرومی اور بدبختی کی علامت ہے، سالکین کو شیطان جن ذرائع سے بہکاتا ہے اور محرومی و بدبختی میں مبتلا کرتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ صحبتِ کاملین کے باوجود ان کی ناقدری میں مبتلا کر دیتا ہے اور یہ فیض سے محروم کر دینے والی بات ہے۔

ایک بزرگ کا استحضارِ موت - ایک واقعہ

استحضارِ موت کا ذکر چل رہا تھا، اس پر یہ فرمایا کہ ایک بزرگ جنگل میں رہتے تھے، ان کے پاس ایک بادشاہ ملاقات کے لیے گیا، دیکھا کہ وہاں کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے، گفتگو ہوئی، واپسی کے وقت بادشاہ نے پوچھا کہ حضرت! آپ کے کھانے کا کیا نظام ہے؟ آپ اس جنگل میں کیا کھاتے ہیں؟

حضرت نے فرمایا کہ میرے پاس کچھ گولیاں ہیں، جن کو کھا لیتا ہوں، جو مجھے کافی ہو جاتی ہیں، چاہو تو تم بھی لے جاؤ، یہ کہہ کر چند گولیاں بادشاہ کو بھی دے دیں، جب بادشاہ نے یہ گولیاں کھائیں، تو ایسا محسوس ہوا کہ جسمانی اور باہی طاقت و قوت میں اضافہ ہو گیا ہے، عورتیں نہ کافی ہو رہی ہیں، ایک رات میں کئی کئی عورتوں سے ملاقات کرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے، بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان گولیوں سے اتنی قوت آ جاتی ہے کہ مجھے میری عورتیں نہ کافی ہو رہی ہیں، تو ان بزرگ کا کیا حال ہوگا، جو صرف یہی گولیاں کھاتے ہیں، ان کے پاس کتنی عورتیں آتی ہوں گی؟ دماغ میں ایک وسوسہ آیا، پھر وہ بادشاہ دوبارہ ان بزرگ صاحب کے پاس ملنے کے لیے گیا، کبھی اللہ کی طرف سے اللہ والوں کو لوگوں کے خیالات و وساوس کی اطلاع دے دی جاتی ہے، تو ان بزرگ کو بھی بادشاہ کے خیال پر مطلع کر دیا گیا، چناں چہ انھوں نے اس بادشاہ سے پوچھا کہ کیا آپ نے وہ گولیاں کھا لی تھیں؟ کیا حال رہا؟

کہا کہ حضرت واقعی بہت عجیب وغریب گولیاں ہیں، کھانا پینا سب اُسی میں ہے، بزرگ نے کہا کہ جی چاہتا ہے کہ اور کچھ گولیاں دوں، یہ لے جائیے؛ مگر یاد رہے کہ چالیس دن میں آپ کا انتقال ہو جائے گا، بس یہ سنتے ہی اُس کی حالت خراب وخستہ ہو گئی، وہیں سے لوگوں کو اسے اُٹھا کر لانا پڑا اور جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی، دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے، ہاتھ پیر کام نہیں کر رہے ہیں، سارے درباری اور گھر والے پریشان ہیں، وہ گولیاں بھی کھالیا کہ کچھ حالت بہ حال ہو؛ مگر اب کسی غیر عورت کا تو کیا خیال آتا؟ اپنی بیویوں کا بھی خیال نہیں آرہا ہے اور جب چالیسواں دن آیا، تو مت پوچھو کہ کیا حال ہوا؟ موت کا انتظار ہو رہا ہے کہ نہ معلوم عزرائیل علیہ السلام کس وقت اور کہاں سے آجائیں؟ بڑی مشکل سے دن کٹا؛ مگر موت نہیں آئی اور نہ فرشتہ نظر آیا، پھر دو چار دن اور انتظار کرنے کے بعد بھی موت نہیں آئی، تب اس کی حالت میں کچھ کچھ سدھار آیا اور بادشاہ پھر ان بزرگ سے ملنے کے لیے گیا کہ پوچھوں کہ قصہ کیا ہے؟ بزرگ نے بادشاہ کو دیکھ کر خیریت دریافت کی، اس نے کہا کہ حال کیا پوچھتے ہو؟ میں تو بے حال ہوں، مرا تو نہیں؛ مگر حالت مرنے سے زیادہ خراب ہو گئی، بزرگ نے فرمایا کہ بھائی! آپ کو تو چالیس دن کی مہلت بتائی تھی، آپ کو ان چالیس دنوں میں ان گولیوں کے کھانے کے باوجود اِدھر اُدھر کا خیال نہیں آیا اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہر وقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اب موت آئے گی، اب اللہ کا فرشتہ آئے گا، تو کیا ہمارا خیال کسی ایرے غیرے کی طرف جائے گا؟ ہم تو اللہ کے پاس جانے تیار بیٹھے ہیں، تو ہم کو غلط خیال کیسے آسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ استحضارِ موت اگر کسی کو نصیب ہو، تو اس سے خود بہ خود گناہ چھوٹ جاتے ہیں؛ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ موت کا استحضار پیدا ہو جائے۔

آخرت کے عمل میں نیت کی کمزوری

آج ہم لوگ آخرت کے اعمال تو بجالارہے ہیں؛ مگر عمل میں نیت کی کمزوری ہے یعنی اخلاص کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے سارے اعمال ضائع ہورہے ہیں، ایک بزرگ تھے، وہ تکبیرِ اُولیٰ کا بڑا اہتمام کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کی ایک رکعت چھوٹ گئی، تو وہ امام کے سلام کے بعد اپنی نماز پڑھ رہے تھے، سارے لوگ ان کو دیکھنے لگے کہ ان کی آج ایک رکعت چھوٹ گئی، تو لوگوں کے دیکھنے کی وجہ سے ان کو شرم آئی، پھر وہ بزرگ ساری زندگی کی نمازیں دھرانے لگے، پوچھا گیا، تو فرمایا کہ لوگوں کے دیکھنے سے مجھے شرم آئی، معلوم ہوا کہ میری توجہ خالق کی طرف نہیں؛ بل کہ مخلوق کی طرف ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اب تک بھی جو نمازیں پڑھی ہیں، وہ مخلوق کے لیے پڑھی ہیں، اللہ کے لیے نہیں پڑھی؛ اس لیے ساری نمازیں دھرارہا ہوں۔

غور کیجیے کہ یہ بزرگ تیس سال کی نمازیں دھرارہے ہیں، یہ سمجھ کر کہ میری نیت میں کمزوری ہے، اس طرح کبھی نیت میں فتور پیدا ہوجاتا ہے؛ اس لیے اپنی نیتوں کو خالص بنانے کی فکر کرنا چاہیے؛ ورنہ سب کچھ کیا کرایا پانی میں چلا جاتا ہے۔

استحضارِ موت کے لیے مراقبہ

فرمایا: اللہ والے فرماتے ہیں کہ روزانہ کچھ وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ کرنا چاہیے، اس سے موت کا استحضار پیدا ہوگا اور یہ گناہوں سے بچنے کی آسان تدبیر ہے۔ خلوت میں بیٹھ کر یہ سوچے کہ میں بھی ایک دن مرجاؤں گا، مجھے بھی غسل دیا جائے گا، کفن پہنایا جائے گا، پھر قبرستان لے جایا جائے گا، پھر لوگ مجھے قبر میں

اتاریں گے، میرے اوپر مٹی ڈالیں گے، مجھے تن تنہا قبر کی اندھیریوں میں چھوڑ کر آجائیں گے، پھر مجھ سے سوالات ہوں گے، مجھے ہر ہر چیز کا حساب دینا ہوگا، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی، نہ معلوم میرا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یا بائیں ہاتھ میں؟ سالک ایسا مراقبہ روزانہ کرے تو ہمیشہ موت کا استحضار رہے گا۔

﴿أيام خالية﴾ کی دو تفسیریں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (الحاقۃ: ۲۴) (مزے لے کر کھاؤ اور پیو گذرے ہوئے دنوں میں جو کچھ نیک اعمال کیے ہیں ان کے بدلے میں) علما نے ﴿أَيَّامٌ خَالِيَةٌ﴾ کی دو تفسیریں کی ہیں: خالیۃ کے ایک معنی "ماضیة" (گذرے ہوئے) کے ہیں یعنی دنیا میں تم نے ہمارے حکم کے مطابق جو دن گزارے ہیں، اس کے بدلے میں کھاؤ اور پیو۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ دنیا میں کچھ ایام تم نے خالی خالی گزارے ہیں، شہوات سے خالی، لذات سے خالی، تمناؤوں سے خالی، نفسانی خواہشات سے خالی، تمھاری مرضی کی زندگی تم نے نہیں گزاری، اس لیے جنت میں کھاؤ اور پیو۔

لہٰذا جو یہاں دنیا میں اپنے ایام نفسانی خواہشات سے خالی گزارے گا اور دنیا کی فانی نعمتوں کو اللہ کے لیے قربان کردے گا، اس کو وہاں کی عظیم اور فنا نہ ہونے والی نعمتیں عطا کی جائیں گی۔

ایک دلہن سے عبرت

فرمایا کہ ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، چناں چہ اس کو سجایا گیا، کپڑے پہنائے گئے، زیور پہنایا گیا اور سارے لوگ، رشتہ دار، سہیلیاں، دوست واحباب

اسے دیکھ کر خوش ہونے لگے اور کہنے لگے کہ ماشاءاللہ! کتنی اچھی لگ رہی ہے؟! کیا خوبصورت لگ رہی ہے؟! سب اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنے لگے اور سب رشتہ دار و دوست واحباب خوشی کا اظہار کر رہے تھے؛ مگر اس لڑکی کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی، وہ غمزدہ تھی، اس سے پوچھا گیا کہ کیا بات ہے کہ تو خوش نہیں ہے؟ تو اس لڑکی نے عجیب جواب دیا، کہنے لگی کہ تم سب تو مجھ سے خوش ہو اور میرے حسن و جمال کی تعریف کر رہے ہو، مجھے پسند کر رہے ہو؛ مگر میں اس فکر میں ہوں کہ جس کے لیے مجھے سنوارا جا رہا ہے یعنی میرا شوہر، اگر وہ مجھے پسند نہ کرے تو میرا کیا ہوگا؟ مجھے یہ فکر دامن گیر ہے، جس کی وجہ سے میں غمزدہ ہوں، ایک بزرگ نے یہ واقعہ سنا کر کہا کہ اس لڑکی کو جس قدر احساس تھا، ہمیں وہ اللہ کے بارے میں حاصل ہو جائے، تو ہماری آخرت سنور جائے، ہم یہ سوچیں کہ ہم سے ہمارا خالق و مالک راضی ہو، ہم دوسروں کے خوش ہونے پر خوش ہو جاتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ ہم سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہیں کہ نہیں؟ لہٰذا ہم کو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اگر ساری دنیا ہماری عبادت سے خوش ہو جائے، ہمارے علم سے خوش ہو جائے، ہمارے کسی کردار سے خوش ہو جائے؛ مگر خدا تعالیٰ ہماری عبادت و ریاضت کو پسند نہ کرے اور کہہ دے کہ تیری عبادت مجھے پسند نہیں تو کیا ہوگا؟ اس لیے دنیا والوں کی تعریف پر خوش نہیں ہونا چاہیے، ہمیں تو اللہ کو خوش کرنا ہے، اللہ خوش ہو جائے تو پھر ساری دنیا ناراض ہو، تو بھی کوئی حرج نہیں۔

دنیادار کون ہے؟

ایک مجلس میں فرمایا کہ آج لوگ سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس مال ہے، وہ دنیادار ہے، یہ بات غلط ہے؛ اس لیے کہ اسی مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کر کے انسان بڑا اللہ والا بن سکتا ہے؛ اسی لیے ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ ''چیست دنیا''؟ (دنیا

کسے کہتے ہیں؟) تو انھوں نے جواب دیا کہ ''از خدا غافل بودن'' (دنیا، اللہ سے غافل ہونے کو کہتے ہیں) یہ نہیں کہا کہ دنیا مال کا نام ہے، کپڑے کا نام ہے، بلڈنگ کا نام ہے، زیور کا نام ہے، سونے چاندی کا نام ہے، بل کہ فرمایا کہ اللہ سے غافل ہونے کا نام دنیا ہے، معلوم ہوا کہ ایک آدمی کروڑ پتی ہے؛ مگر وہ اللہ سے غافل نہیں، اللہ کے احکام پر اس کی زندگی ہے، اس کے اعضا اطاعت و بندگی میں لگے ہوئے ہیں، اس کا مال اللہ کے راستے میں خرچ ہو رہا ہے، تو وہ کروڑ پتی ہونے کے باوجود دنیا دار نہیں اور ایک آدمی کے پاس بالکل مال نہیں، بھکاری ہے، فقیر ہے، نہ کپڑے ہیں، نہ کھانا ہے؛ لیکن اس کے باوجود دنیا کی محبت دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اللہ کی اطاعت وفرماں برداری نہیں کرتا؛ بل کہ اللہ کے احکام کو دن رات پامال کرتا رہتا ہے، تو یہ فقیر بہت بڑا دنیا دار ہے۔

معلوم ہوا مال ہونے یا نہ ہونے سے دنیا داری کا کوئی تعلق نہیں، ایک آدمی کروڑ پتی ہونے کے باوجود دین دار ہوسکتا ہے اور ایک آدمی فقیر ہونے کے باوجود دنیا دار ہوسکتا ہے۔

نیم شب کی دولت

فرمایا کہ راتوں میں اُٹھ کر اللہ کی عبادت کا جو لطف ومزہ ہے، وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے اور اس کا کیف ولذت عجیب ہوتی ہے اور جن کو یہ دولتِ نیم شبی مل جاتی ہے، ان کی نظر میں دنیا ہیچ در ہیچ ہو جاتی ہے، اسی لیے اولیاء اللہ کو دنیا ہیچ نظر آتی ہے، اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ حضرت شیخ المشائخ عبدالقادر جیلانی رَحِمَہُ اللہُ کے زمانے کا جو بادشاہ تھا، اُس کو معلوم ہوا کہ حضرت کے دستر خوان پر روزانہ ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں، مہمانوں کی بھرمار رہتی ہے، لوگ اُن کے پاس اللہ کی معرفت ومحبت

لینے آتے ہیں، ذکر سیکھنے آتے ہیں، تو اُس نے سوچا کہ حضرت اتنی بڑی خدمت کرتے ہیں، تو اُن کے لیے میری حکومت کا آدھے حصہ کا خراج دے دینا چاہیے؛ تاکہ اُس کی آمدنی سے یہ لوگوں کی خدمت کریں، چناں چہ حضرت کو اس نے خط لکھا، اس میں لکھا کہ حضرت! میں آپ کے لیے میری ''نیم روز حکومت'' کا آدھا حصہ وقف کرنا چاہتا ہوں، اس کو قبول کیجیے۔ حضرت عبد القادر جیلانی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس خط کی پشت پر جواب لکھ کر بھیج دیا کہ اللہ نے جب سے نیم شب کی دولت دی ہے، ''نیم روز'' کی کوئی ہوس نہیں رہی، نیم شب کیا ہے؟ رات میں اٹھ کر اللہ کو یاد کرنا، اس کے سامنے گڑگڑانا اس کی لذت جسے مل جاتی ہے، اسے ہفت اقلیم کی سلطنت بھی بے کار نظر آتی ہے۔

گناہ ظلمت ہے

ایک مجلس میں حضرت والا نے فرمایا کہ آدم عَلَیْہِ السَّلَامُ کو اللہ نے جنت میں ہر چیز کے کھانے کی اجازت دی؛ مگر ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا؛ لیکن آدم عَلَیْہِ السَّلَامُ شیطان کے بہکاوے میں آکر شجر ممنوعہ کھا بیٹھے، تو ان کے بدن سے جنت کا نورانی لباس اتار لیا گیا؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ جہاں نور ہوتا ہے، وہاں ظلمت نہیں ہوتی، جہاں ظلمت ہو، وہاں نور نہیں رہ سکتا، فرمایا کہ جب اللہ نے حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَامُ سے صرف ایک گناہ سے نورانی لباس نکال لیا، تو سوچو کہ جو لوگ گناہ پر گناہ کرتے ہیں، تو ان کے پاس نور کہاں رہے گا؟! جو نور نماز، روزہ، ذکر سے آیا تھا، وہ گناہ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔

نیک جذبہ مہمان ہے

حضرت اسماعیل شہید رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا کہ مؤمن کے دل میں نیکی کا جذبہ

آئے تو یوں سمجھو کہ مہمان آیا ہے، اس کی عزت ، خاطر مدارت اور استقبال کرنا چاہیے۔ جیسے کسی مہمان کے آنے پر کرتے ہیں، اگر گھر میں آنے والے مہمان کی تعظیم وتکریم نہ کی گئی، تو وہ پھر کبھی نہیں آئے گا، اسی طرح اگر کوئی اس مہمان کی مہمان نوازی نہیں کرے گا، تو وہ پھر کبھی نہ آئے گا، اگر آپ اس کی عزت کریں گے تو وہ مہمان آتا رہے گا، جتنا اس کی مہمان نوازی کرو گے اتنا ہی وہ آپ کے پاس آتا رہے گا۔

اس اللہ کے مہمان کی خاطر مدارات وعزت کیا ہے؟ یہ ہے کہ اس نیک جذبے پر عمل شروع کر دیا جائے۔ مثلاً نماز کا جذبہ آیا تو فوراً نماز پڑھنا شروع کر دے، ذکر کا جذبہ آیا تو ذکر شروع کر دے، صدقے کا جذبہ آیا تو صدقہ دے دے۔

گنہ گاروں کے لیے سامانِ تسلّی

انسان گناہ کرنے سے ناپاک ونجس ہو جاتا ہے اور اس نجاست کو پاک کرنے کا طریقہ توبہ واستغفار ہے، حدیث میں ہے: ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ'' (توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا کہ اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو) مگر بعض جاہل لوگ توبہ واستغفار کرنے سے گھبراتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اتنے ناپاک ونجس ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محترم ومقدس جناب میں کس طرح جائیں؟ یہی خیال ان کو توبہ سے محروم کر دیتا ہے، یہ بڑی سخت بات ہے، مولانا روم رحمۃ اللہ نے ایک تمثیلی حکایت لکھی ہے کہ ایک آلودہ نجاست کپڑے سے پانی نے کہا کہ تو ناپاک ونجس ہو گیا ہے، جلدی سے میرے اندر آجا، میں تجھ کو پاک وصاف کر دوں گا، اس پر ناپاک ونجس کپڑے نے کہا کہ مجھے پانی سے شرم آتی ہے کہ پانی تو ایسا صاف وپاک اور میں اس قدر گندہ وناپاک، ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' بھلا میں کس منہ سے پانی میں جاؤں؟ اس پر پانی نے کہا اور واقعی بالکل سچ کہا کہ اگر تو مجھ سے شرم کر کے میرے

پاس نہ آیا، تو تیرے پاک ہونے کی کوئی صورت نہیں، بغیر مجھ سے ملے نجاست کے زائل ہونے کا کوئی مطلب نہیں، واقعی نجاست کے دور کرنے اور پاک کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ پانی میں غوطہ لگائے، کوئی شخص شرم کرتا ہوا پانی کے پاس نہ گیا، تو وہ کبھی نجاست سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا، بالکل اسی طرح باطنی نجاست وگندگی سے رہائی وصفائی کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف لپکے اور اس کے دریائے رحمت کے پاک و صاف پانی میں غوطہ لگائے اور اس سے توبہ واستغفار کرے، اللہ سے شرم کر کے اس کی جناب میں نہ جانا اور توبہ واستغفار نہ کرنا بڑی حماقت ہے۔ جیسے نجاست آلودہ کا پانی سے شرم کرنا حماقت ہے، مولانا روم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

آب گفت آلودہ را در من شتاب
گفت آلودہ کہ دارم شرم از آب

(پانی نے آلودۂ نجاست سے کہا کہ جلدی سے میرے پاس آجا، تو وہ آلودۂ نجاست کہنے لگا کہ پانی سے مجھے شرم آتی ہے۔)

گفت آب این شرم بے من کے رود؟
بے من آلودہ زائل کے شود؟

(پانی نے اس کے جواب میں کہا کہ میرے پاس آئے بغیر تیری یہ شرم کیسے ختم ہوسکتی ہے؟ اور میرے بغیر یہ آلودگی کیسے زائل ہوسکتی ہے؟)

آگے فرماتے ہیں:

ازآب ہر آلودہ کو پنہاں شود
"اَلْحَیَاءُ یَمْنَعُ الْاِیْمَانَ" بود

یعنی اگر ہر آلودہ نجاست اسی طرح پانی سے شرم کرتے ہوئے چھپتا رہے گا، تو یہ

شرم بجائے "اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ" ہونے کے "اَلْحَیَاءُ یَمْنَعُ الْاِیْمَانَ" ہو جائے گی، معلوم ہوا کہ ایسی شرم وحیا مذموم ہے، جس سے ایمان کو بھی خطرہ ہے، یہاں تو بے شرم ہو کر خدا کے دربار میں حاضر ہو جانا اور معافی مانگنا چاہیے۔

معرفت کی حقیقت

تخلیقِ انسان کا مقصد قرآن نے عبادت کو بتایا ہے۔ چناں چہ فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰرِیٰت :۵۶) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس جگہ عبادت کی تفسیر "معرفت" سے کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تخلیقِ انسان کا اصل مقصد معرفتِ خداوندی ہے اور ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًّا فَاَرَدْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ" (میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میری معرفت ہو، سو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔) اس حدیث کے متعلق صوفیا نے فرمایا ہے کہ صحیح ہے اور محدثین نے فرمایا کہ یہ الفاظ ثابت نہیں، ہاں اس کا معانی صحیح ہیں، جیسا کہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد معرفت ہے اور معرفت کے لفظی معنی ہیں: جاننا پہچاننا اور مرادی معنی یہ ہیں کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال کو اس طرح جاننا کہ ان اوصاف وافعال کا اثر بندے کے احوال وافعال واخلاق پر ظاہر ہو۔

مثلاً اللہ کے جمال وکمال اور عطا ونوال کو دیکھ کر اللہ سے محبت ہو جائے؛ کیوں کہ یہ اوصاف محبت کے مقتضی ہیں۔ چناں چہ دنیا میں بھی محبت، انھی اوصاف پر مرتب ہوتی ہے، جب خداوند تعالیٰ کے جمال وکمال کو جان وپہچان لیا، تو اس کا اثر

(محبت) ہونا بھی ضروری ہے، اسی طرح اللہ کی صفتِ رحیمیت ورحمانیت کو جان کر اللہ سے اُمید ورجا کا ہونا فطری بات ہے، اسی طرح اللہ کی صفتِ جلال وقہر کو معلوم کرکے، اس سے خوف کھانا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو جاننے کے بعد اس پر توکل واعتماد کا حاصل ہونا لابدی ہے، وعلی ہذا القیاس دیگر اوصاف کا حال ہے۔ الغرض خدا کے اوصاف وافعال کو اس طرح جان لینا کہ اس کا اثر جاننے والے پر ظاہر ہو، اس کو معرفت کہتے ہیں۔

اگر محض اللہ کے اوصاف وکمالات کو جاننا ہوا تو یہ لغوی معرفت ہے، اصطلاحی معرفت نہیں، جو کہ مطلوب ہے، اسی سے محض عالم اور ایک عارف باللہ کے درمیان فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ محض عالم، قرآن وحدیث کے علم کی وجہ سے اللہ کے اوصاف وکمالات کو پورے دلائل کے ساتھ جانتا ہے؛ مگر اس کا اثر اس میں ظاہر نہیں ہوتا؛ کیوں کہ وہ عارف نہیں اور عارف ان اوصاف کے اثرات سے متاثر ہوتا ہے اور اس میں محبت وخشیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عارف محض عالم نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ اپنے علم کے آثار واثرات کا حامل اور ان پر عامل بھی ہوتا ہے۔

ایک حدیث پر شبہ کا جواب

فرمایا کہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات میں آیا ہے: ”كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ أَحْيَانِهٖ“ (آپ ہمہ وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

(الصحيح للمسلم:۳۷۳،الجامع للترمذي:۳۳۸۴،صحيح ابن خزيمة: ۱/۱۰۴،صحيح ابن حبان:۳/۸۱،مسند أبو عوانة:۱/۱۸۴)

اس پر علما نے کلام کیا ہے کہ یہاں ذکر سے کونسا ذکر مراد ہے؟ علما نے فرمایا کہ

اس سے مراد ذکرِ قلبی ہے، نہ کہ ذکرِ لسانی اور حضراتِ علما کو دراصل پریشانی یہ پیش آئی کہ بیت الخلا جانے کے موقعے پر اور بعض ضروریات وحاجات کے موقعے پر ذکر لسانی ممنوع ہے؛ کیوں کہ یہ اسمِ الٰہی کی اہانت کا موجب ہے، پھر آپ ہمہ وقت ذکرِ لسانی کیسے کر سکتے ہیں؟ لہٰذا علما نے ذکرِ قلبی مراد لیا؛ تاکہ یہ اشکال ختم ہو جائے۔

اس ناکارے کے ذہن میں ایک دوسری بات آتی ہے: وہ یہ کہ یہاں حدیث میں ذکر سے مراد قلبی کے ساتھ لسانی بھی ہے یعنی صرف قلبی نہیں؛ بل کہ قلبی ولسانی دونوں مراد ہیں اور مذکورہ شبہ کا حل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جمہور علما اور خصوصاً ائمۂ اربعہ کا مسلک یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فضلہ پاک ہے۔ جیسا کہ اپنی جگہ اس کے دلائل مذکور ہیں ، اس بنا پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیت الخلا والی حالت نجاست سے ملوث نہیں؛ لہٰذا اس موقعے پر بھی آپ کے لیے ذکرِ لسانی ممنوع نہ تھا اور دوسروں کے لیے ممنوع ہے؛ کیوں کہ باقی سب لوگ اس موقعے پر نجاست سے ملوث وآلودہ ہوتے ہیں اور ذکرِ لسانی کے اس موقعے پر ممنوع ہونے کی علت دراصل یہی " تلوّث بالنجاسة "ہے، بس جہاں یہ مفقود ہے، وہاں ذکرِ لسانی ممنوع بھی نہیں ہے۔

پھر غور کرنے کی بات ہے: "كَانَ يَذْكُرُ اللّٰهَ " والا جملہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے، اس میں ذکر سے ذکرِ لسانی ہی مراد ہونا چاہیے؛ کیوں کہ ذکرِ قلبی تو کسی کے علم میں نہیں آسکتا ، جب علم میں نہیں آسکتا ، تو اس کی خبر وہ کیوں کر کر دے سکتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ یہاں وہ ذکر مراد ہے جس کا علم ہوسکتا ہے اور وہ لسانی ہے نہ کہ قلبی؛ البتہ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بیت الخلا والی حالت بھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخفی ہوتی تھی، تو اس کا جواب آسان ہے، وہ یہ کہ بیت الخلا میں آپ کا ذکر باللسان کرنا صحابہ رضی اللہ عنہم

کو معلوم ہوسکتا تھا، اس طرح کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اس موقعے پر باہر جو انتظار میں رہتے تھے، انھوں نے سنا ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات اور ان کے شوقِ علم سے یہ بعید از قیاس نہیں؛ لہٰذا یہ بات ممکن ہے کہ مخفی ہونے کے باوجود ذکرِ لسانی معلوم ہوجائے۔

ہاں اس پر ایک قوی شبہ اس حدیث سے ہوسکتا ہے، جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی حضرت مہاجر بن قنفذ رضی اللہ عنہ کے سلام کا جواب استنجا سے فراغت کے بعد اس لیے نہیں دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لفظ ''سلام'' جو کہ اللہ کا نام ہے، اس حالت میں لینا نہیں چاہتے تھے۔

(المستدرک للحاکم :۲۷۲/۱، صحیح ابن خزیمة :۱۰۳/۱، صحیح ابن حبان:۸۲/۳، السنن لأبي داؤد:۱۷)

اس سے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذکرِ لسانی سے اس حالت میں احتراز فرماتے تھے؛ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی کیا ہے؛ تاکہ افضلیت پر عمل ہو، ورنہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے خلاف بھی ثابت ہے، چناں چہ امام بخاری وامام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار وہ اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا جو ازواجِ مطہرات میں سے ہیں، ان کے گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو گئے آدھی رات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے اور بیٹھ کر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، پھر وضو فرمایا۔

(الصحیح للبخاري: ۱۳۷، الصحیح للمسلم:۷۶۳)

اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ آپ نے بغیر وضو اللہ کا کلام پڑھا اور اس میں اللہ کا نام تو ہے ہی۔

ہماری دعا قبول نہ ہونے کا سبب

ایک شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ ﴾ (غافر: ۶۰) (مجھے پکارو میں جواب دوں گا) لیکن ہم دعا کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتی، اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ اس کی وجہ پانچ باتیں ہیں:

(۱) تم نے خدا کو پہچانا؛ لیکن اس کا حق ادا نہیں کیا۔

(۲) تم نے قرآن تو پڑھا؛ مگر اس پر عمل نہیں کیا۔

(۳) اور تم نے محبت رسول کا دعویٰ کیا؛ لیکن ان کی سنت کو ترک کر دیا۔

(۴) تم نے زبان سے ابلیس پر لعنت کی؛ لیکن عمل میں اس کی اطاعت کی۔

(۵) تم نے اپنے عیوب کو چھوڑ دیا اور لوگوں کی برائیاں پکڑنے میں مشغول ہو گئے۔

دنیوی عیش باعثِ شرمندگی ہوگا-ایک واقعہ

فرمایا کہ ہندوستان کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی مرحوم، جو کہ انگریزی دور حکومت میں چیف جسٹس کے عہدے پر فائز تھے، ایک بار ان کے گھر پر ایک میٹنگ کے لیے بڑے بڑے لوگ جمع تھے اور ان کے والد بھی باحیات تھے، بوڑھے تھے، درمیان مشورہ ان کے والد اس کمرے میں جہاں میٹنگ ہو رہی تھی، آئے اور سلام کیا اور اپنے ہاتھ میں غبارہ (جس کو ہمارے علاقے میں عوام الناس ''انڈا'' کہتے ہیں) جو کھلونہ ہے، لے کر آئے اور اپنے صاحب زادے اکبر الہ آبادی کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ تم اس کو بچپن میں بہت پسند کرتے تھے اور اس سے کھیلتے تھے؛ اس لیے یہ تمھارے لیے لایا ہوں۔ یہ سن کر اور دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوئے؛ کیوں کہ ان کے

سامنے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، خیال کیا ہوگا کہ یہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی یہ غبارہ کا شوقین ہے؟ الغرض ان کا چہرہ شرمندگی کی وجہ سے بدل گیا اور لال پیلا ہونے لگا۔ جب ان کے والد نے چہرہ دیکھ کر پہچان لیا کہ وہ شرمندہ ہیں اور اس کی وجہ سے لال پیلے ہورہے ہیں، تو کہنے لگے کہ بیٹا دیکھو! یہ چیز جو تم کو میں نے دیا ہے، اس کو تم بچپن میں ضد کر کے حاصل کرتے تھے اور آج اسی چیز کے پیش کرنے سے تم کو شرم آرہی ہے، یہ خیال ہو رہا ہے کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں اور مجھے یہ حقیر و بے حقیقت چیز دی جارہی ہے، یاد رکھو کہ اسی طرح کل قیامت کے دن، دنیا کی یہ باغ و بہار، یہاں کی یہ آرام و آسائش کی چیزیں، یہ دنیوی عہدے و مناصب بھی تم کو شرمندہ کر دیں گے؛ لہٰذا ان پر ہی مت ریجھو اور اس پر فخر نہ کرو۔

صاحبو! کیسی عجیب بات کہی ہے انہوں نے؟! یہ ہم سب کے لیے عبرت کی بات ہے، آج ہر آدمی کو ڈگری ملنے پر، یا کوئی عہدہ ملنے پر خوشی ہوتی ہے، کوئی بلڈنگ بناتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے اور خوشی کے ساتھ وہ فخر و غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے، دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے؛ مگر یہ نہیں سوچتا کہ کہیں یہی چیزیں میرے لیے آخرت میں شرمندگی کا باعث تو نہیں بن جائیں گے؟ لہٰذا دنیا میں ایسے کام کرنا چاہیے، جن پر آخرت میں شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

ایک سوال کا جواب

فرمایا کہ ایک سالک نے پوچھا کہ کسی اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور اس کا قرب پا کر خیالات میں تلاطم برپا ہونا، تو فطری بات ہے اور ہونا بھی چاہیے؛ ورنہ تو صحت مندی کے خلاف ہوگا، پھر اس میں خرابی و برائی کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ بلا شبہ اچھی صورت کو دیکھ کر متاثر ہونا اور قرب پا کر جذبات میں ہیجان و تلاطم بپا ہونا عین فطرت ہے اور بلا شبہ صحت مندی کی علامت ہے؛ لیکن صورت کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنے کی فکر کرنا اور قرب حاصل کرنا حماقت ہے، جہالت ہے؛ بل کہ شرارت ہے اور خباثت ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی ایک مثال سمجھیے کہ ایک آدمی آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اس کی گرمی کا احساس کرتا ہے، تو بے شک یہ احساس علامت صحت مندی ہے؛ ورنہ سمجھا جائے گا کہ آدمی بیمار ہے، جس کی وجہ سے اس کو آگ کا احساس نہیں ہو رہا ہے، گرمی کا احساس نہیں ہو رہا ہے اور کہا جائے گا کہ یہ بے حس ہے؛ لیکن کیا یہ سمجھنا صحیح ہوگا کہ آگ میں ہاتھ ڈالنا بھی صحت مندی ہے؟ یا یہ کہیں گے کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے پر گرمی کا احساس تو علامت صحت مندی ہے؛ مگر آگ میں ہاتھ ڈالنا بے وقوفی؛ بل کہ حماقت وجنون ہے، جیسے کوئی بے وقوف اپنی صحت مندی کا ٹسٹ کرنے کے لیے آگ میں ہاتھ ڈال دے تو کیا یہ بے وقوفی کی معراج نہیں کہلائے گی؟ لہٰذا صورتوں کے فتنے سے متاثر ہونا تو صحت مندی ہے اور فطری بات ہے؛ لیکن اس فتنے میں پڑنا بے حد بے عقلی وحماقت ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض جاہل و بے دین صوفی جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اَمردوں اور عورتوں سے متاثر نہیں ہوتے، ان کی یہ بات دو حال سے خالی نہیں یا تو کذب وجھوٹ پر مبنی ہے، یا صداقت پر مبنی ہے، اگر جھوٹ ہے تو اس کا ناقابلِ اعتبار ہونا واضح ہے، اگر صداقت پر مبنی ہے، تو یہ بات ان جاہلوں اور بے دینوں کی طبعیتوں میں بے اعتدالی کی علامت ہے اور فطرت کے خلاف ہونے کی دلیل ہے، جو کسی صورت میں بھی کمال نہیں؛ بل کہ خلافِ کمال ہے، اگر کسی غلبۂ حال کی بنا پر یہ کیفیت ہے، تو صاحبِ حال گو جاہل و بے دین نہ ہو؛ بل کہ دین دار ہو، مگر پھر بھی یہ

کمال نہیں؛ بل کہ زیادہ سے زیادہ اس کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضارِ موت

حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلا تشریف لے جاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے بعد باہر نکل کر تیمّم کرنے لگتے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ذرا اور آگے تشریف لے چلیں وہاں پانی ہے، وضو فرمالیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ابن عباس! "لا أَدْرِي لَعَلِّي لا أَبْلُغُهُ". (کیا اُمید ہے کہ وہاں جانے تک زندہ رہوں گا؟)

(مسند أحمد : ۲۸۸/۱ ، المعجم الكبير للطبراني: ۲۳۸/۱۲ ، الزهد لابن المبارك:۹۹/۱)

دیکھیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا موت کا استحضار تھا، حال آں کہ انبیا کی موت اُن کی اجازت کی بغیر نہیں آتی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ کیا خبر میں وہاں تک پہنچ کر وضو کرلوں گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو معلوم تھا کہ فرشتہ میری اجازت کے بغیر روح قبض نہیں کرے گا؛ مگر آپ امتیوں کو اپنے عمل سے استحضارِ موت کی تعلیم دینا چاہتے تھے کہ ایسا استحضار رکھو!!

زہد وعبادت کا غرور زہر قاتل

فرمایا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ سے ایک شیخ نے اپنے احوال لکھ کر علاج دریافت کیا، سوال کا حاصل یہ تھا کہ "میں اگر ریاضت وعبادت کرتا ہوں تو نفس میں فخر وغرور پیدا ہوتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ میرے جیسا کوئی نیک نہیں ہے، میں بہت بڑا اور نیک ہوں اور اگر مجھ سے کوئی گناہ ہوجاتا ہے اور خلافِ شرع

کوئی کام کر بیٹھتا ہوں، تو اپنے آپ کو ذلیل وخوار اور بدترین خلائق تصور کرتا ہوں، اس حالت کا علاج بتایا جائے؟

اس خط کے جواب میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رَحِمَہُ اللّٰہ نے جو جواب تحریر فرمایا، وہ ہر ایک کے لیے عموماً اور سالکین راہِ طریقت کے لیے خصوصاً آبِ حیات سے کم نہیں، جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد جو عاجزی وخواری، انکساری و مسکنت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ دراصل گناہ پر ندامت وافسوس کا نتیجہ ہے، جو کہ اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور بہت اچھی حالت ہے؛ کیوں کہ گناہ کے بعد ندامت بھی پیدا نہ ہونا اور گناہ سے لذت گیر ہونا، گناہ پر اصرار کے مترادف ہے اور اگر چھوٹے گناہ پر اصرار ہو تو وہ کبیرہ گناہ ہو جاتا ہے اور کبیرہ گناہ پر اصرار کفر کی دہلیز ہے؛ لہٰذا آپ کو گناہ کے بعد جو ندامت ہوتی ہے، اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہیے۔

امام ربانی رَحِمَہُ اللّٰہ نے فرمایا کہ نیکی کرنے کے بعد جو غرور وتکبر پیدا ہوتا ہے، یہ زہر قاتل ہے اور لا علاج ومہلک مرض ہے، جو نیک اعمال کو اسی طرح نیست ونابود کر دیتا ہے، جس طرح خشک لکڑیوں کو آتش جلا کر تباہ کر دیتی ہے، فرمایا کہ اس حالت کے مقابلے میں پہلی حالت کہ گناہ کر کے شرمندہ ہو، بہت بہتر اور عمدہ حالت ہے۔

مجدد صاحب رَحِمَہُ اللّٰہ فرماتے ہیں کہ یہ غرور اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اپنے اعمال نہایت خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان کو اچھا سمجھتا ہے؛ اس لیے اس کا علاج اس کی ضد سے کرنا چاہیے؛ لہٰذا اپنی نیکیوں کو ناقص وناخالص سمجھے اور ان کے پوشیدہ عیبوں کو نگاہ میں رکھے اور اپنے کو قاصر سمجھے۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں یہ کبھی خیال نہ کرنا چاہیے کہ اپنی نیکیوں میں کوئی عیب وکمی نہیں ہے، اگر تھوڑی بھی توجہ کرے گا تو اللہ کی توفیق سے اپنی نیکیوں میں سراپا

عیب دیکھے گا اور حسن کا شائبہ بھی محسوس نہ ہوگا، پھر غرور کیسا اور نخوت کیسی؟ بل کہ اپنے اعمال میں قصور ونقصان ہونے کا اتنا غلبہ ہو کہ نیکی کرنے کے بعد شرمندہ ونادم ہو، نہ کہ مغرور و بے پرواہ۔ (مکتوب نمبر:۵۳)

عبادت کا کفارہ سیئات ہونا، صغیرہ کے ساتھ مختص ہونے کی حکمت

مختلف عبادات کے بارے میں احادیث سے ثابت ہے کہ وہ کفارۂ سیئات ہوتے ہیں، علما نے ان احادیث کو صغیرہ گناہوں پر محمول کیا ہے؛ اس لیے کہ کبیرہ تو صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں، بندے کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ کبیرہ وصغیرہ ہر گناہ میں اصل تو یہی ہونا چاہیے کہ آدمی توبہ کرے اور بغیر توبہ کے کوئی گناہ بھی معاف نہ ہو، نہ چھوٹا نہ بڑا؛ مگر اس میں دشواری یہ تھی کہ بہت سے گناہ صغیرہ آدمی سے چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، آسانی کے ساتھ اس طرح سرزد ہوجاتے ہیں کہ اس کو احساس تک نہیں ہوتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے اور وہ بے خبری اور بے شعوری میں ان میں ملوث ہوجاتا ہے، اگر ان کو توبہ پر موقوف رکھا جاتا، تو شاید ہی ہم کبھی ان سے بری ہوتے اور توبہ کرکے ان سے پاک ہوتے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے محض رحمت وشفقت کی بنا پر مختلف عبادات ونیکیوں کو ہمارے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنادیا گیا، اس کے برخلاف کبیرہ گناہ چند ایک ہیں، اور ان کا معلوم ہونا اور احساس ہونا بعید از قیاس نہیں؛ لہٰذا وہاں شرطِ توبہ برقرار رکھی گئی۔

"الدنيا سجن المؤمن" کی عجیب تشریح

حدیث میں آتا ہے:" الدنيا سجن المؤمن ، و جنة الكافر "(دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔)

(الصحیح للمسلم :۲۹۵۶،الجامع للترمذي:۲۳۲۴،السنن لابن ماجة :۴۱۱۳،
صحیح ابن حبان:۴۶۳/۲،المستدرک للحاکم:۶۹۹/۳،مسند أحمد:۳۲۳/۲)

اس کی مختلف توجیہات حضراتِ علما نے بیان فرمائی ہیں؛ مگر ایک تفسیر صوفیائے کرام نے بیان فرمائی ہے، وہ نہایت لذیذ بھی ہے اور بہت عجیب بھی، وہ یہ کہ یہاں حدیث میں قید سے مراد وہ قید نہیں، جس سے ایذا و تکلیف مقصود ہوتی ہے؛ بل کہ یہ قید ایسی ہے، جیسے طوطے اور بلبل کو قید کرتے ہیں کہ ان کی میٹھی بولی اور لطیف آواز کو سنا کریں گے اور ان سے لطف لیں گے، اس کے برخلاف کوے کو کوئی قید نہیں کرتا؛ بل کہ قید میں آئے بھی تو اس کو آزاد کر دیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالی مؤمن کی فریاد و نالے کو سن کر خوش ہوتے ہیں اور اس نالے کو بار بار سننے کے لیے اس کی حاجات کو وہ فوری طور پر پوری نہیں کرتے؛ بل کہ اس کو اپنی قید میں مقید کر دیتے ہیں؛ تا کہ یہ اپنی میٹھی آواز سے اللہ کو بار بار پکارے اور اللہ تعالیٰ اس کی آواز کو سنیں، اس کے برخلاف کفار کی پکار خدا کو پسند نہیں ہے اور اللہ کے نزدیک اس کی آواز نہایت بھونڈی معلوم ہوتی ہے، جیسے کوے کی آواز بھونڈی ہوتی ہے اور کوئی اس کو سننا بھی پسند نہیں کرتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کفار کی بھونڈی آواز سننا پسند نہیں کرتے؛ لہٰذا جب وہ اللہ کو اپنی حاجات میں پکارتے ہیں، تو فوری طور پر ان کی حاجات کو پورا کر دیتے ہیں؛ تا کہ یہ اپنی بھونڈی آواز بند کر دیں اور یہاں سے دفع ہو جائیں۔

مولانا روم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی عاشق مزاج کے پاس دو عورتیں مانگنے آئیں: ایک ہو بوڑھی اور بدصورت و بھونڈی اور دوسری جوان و خوبصورت، تو وہ بوڑھی کو جلدی سے کچھ دے کر بھگا دے گا؛ مگر خوبصورت عورت سے کہے گا کہ ابھی بیٹھو، پھر دیں گے، روٹی پک رہی ہے، اسی طرح ہزار بہانے کرے گا؛ تا کہ اس سے لطف اندوز ہو۔ فرماتے ہیں کہ اسی طرح اللہ تعالی مؤمن کو قید کرتے ہیں کہ اس

سے وہ خوش ہیں اور کافر کو جلدی دے کر بھگا دیتے ہیں کہ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

واقعی عجیب تفسیر ہے اور اس سے بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ ہماری دعائیں جو دیر سے قبول ہوتی ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت وشفقت ومہربانی ہے کہ وہ ہماری پکار کو سننا چاہتے ہیں؛ اس لیے ذرا دیر سے عطا فرماتے ہیں۔

درجاتِ قرب-ایک اہم تنبیہ

فرمایا کہ بادشاہ کے دربار میں حاضر باش، وزیروں اور کارندوں اور اربابِ دانش وبینش واصحابِ فضل وکمال لوگوں کو بادشاہ کا جو قرب اور رضا حاصل ہوتی ہے، وہ بالکل عیاں ہے، اب اگر بادشاہِ ذی جاہ کسی وزیر ومشیر کو کسی کام پر مقرر کر کے دور کسی مقام پر روانہ کردے تو یہ بہ ظاہر بادشاہ سے دوری ہے؛ لیکن درحقیقت یہ دوری نہیں، بل کہ قرب ہی کا ایک درجہ ہے اور اس ظاہری دوری کے وقت بھی بادشاہ کی رضا اس شخص کو حاصل ہے، البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ پہلی صورت بلا واسطہ قرب کی ہے اور دوسری صورت بالواسطہ قرب کی ہے۔

بعینہٖ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے قرب کے دو درجے ہیں: ایک قرب بلا واسطہ، دوسرا قرب بالواسطہ۔ قرب بلا واسطہ مثال کے طور پر یہ ہے کہ کوئی شخص نماز میں اللہ کے حضور کھڑا ہو، یا تلاوت یا ذکر میں مشغول ہو یا اور کسی عبادتِ مقصودہ میں منہمک ہو، ان تمام صورتوں میں اس کو اللہ تعالیٰ کا قرب بلا واسطہ حاصل ہوتا ہے؛ لیکن کبھی اس حکیمِ مطلق کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ اس شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جائے اور حکم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی خدمت کرو، بیوی بچوں کے نفقے کا انتظام کرو، رشتہ داروں سے ملاقات کرو، مہمانوں کی خدمت کرو، تجارت یا ملازمت کے لیے جاؤ، یا دینی کام کے لیے نکلو۔ مثلاً درس وتدریس کا کام کرو، دعوت وتبلیغ کے لیے لوگوں سے ملو وغیرہ،

پس جو شخص حکم شرع کے مطابق ان کاموں میں لگتا ہے، بہ ظاہر تو وہ عبادات سے دور ہوا؛ لیکن فی الواقع یہ بھی قربِ خداوندی کا بالواسطہ درجہ ہے، اگر بادشاہ کا وزیر یا مشیر دربار سے دور ہو کر دور نہیں؛ بل کہ بادشاہ سے قریب اور اس کی رضا کا مستحق ہے، تو یہ اللہ کے حکم کے مطابق مختلف خدمتوں میں لگا ہوا آدمی بھی ان تمام خدمتوں میں لگ کر خدا سے دور نہیں ہوا؛ بل کہ قرب و رضائے خداوندی کی دولت سے بالواسطہ طور پر مشرف و مالا مال ہے۔

مگر میں یہاں ایک اہم بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں اور بالخصوص سالکین کے لیے اس کو سمجھنا لازمی بات ہے، وہ یہ کہ قرب بالواسطہ میں بھی اللہ کی رضا و قرب حاصل ہونے کے باوجود یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بلا واسطہ قرب ہی اصل ہے اور بالواسطہ قرب اصل نہیں ہے؛ نیز یہ بھی واضح ہے کہ بلا واسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل ہے، جب کہ بالواسطہ قرب کو علی الاطلاق فضیلت حاصل نہیں؛ بل کہ یہ بعض حالات و بعض اشخاص کے لیے بعض حِکَم اور مصالح کے پیش نظر افضل ہو جاتا ہے۔ جیسے بادشاہ کے دربار کی حاضری تو ہر صورت میں افضل ہے؛ لیکن دربار چھوڑ کر کسی اور کام پر جانا اور لگنا ہر صورت میں فضیلت نہیں رکھتا؛ بل کہ خاص حالات و بعض اشخاص کے لحاظ سے اس میں فضیلت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً بادشاہ کو کسی مصلحت سے اپنے وزیر کو کسی دوسرے ملک کا سفیر بنا کر بھیجنا پڑا، تو اب اس وزیر کے حق میں اس حکم کی تعمیل میں بادشاہ سے دور ہو کر دوسرے ملک کو جانا اور اس کام کو انجام دینا افضل ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ الغرض یہ قرب کی دوسری صورت نہ علی الاطلاق افضل ہے اور نہ سب کے لیے افضل ہے۔

لہٰذا دونوں قسم کے قرب کا درجہ ایک نہیں ہوسکتا، جب یہ معلوم ہو گیا تو اسی سے

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرب بالواسطہ کی جتنی راہیں اور سبیلیں ہیں، ان کو ان کے حکم اور مصالح کے پیشِ نظر اختیار کرنے کے بعد فوری طور پر پھر قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے، یہ نہیں کہ صرف اسی قرب بالواسطہ کی صورت پر اکتفا کر کے بیٹھ جائے۔

اس کے لیے ایک مثال عرض کرتا ہوں کہ ایک عالم وفاضل دین وعلم کی خدمت کے لیے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کرتا ہے اور بلا شبہ عالم وفاضل کے لیے یہ کام انتہائی اہم اور ضروری اور در حقیقت اس کا فرضِ منصبی ہے؛ لیکن یہ قرب بالواسطہ کی ایک سبیل وصورت ہے، لہٰذا صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے؛ بل کہ اس سے فراغت کے بعد قرب بلا واسطہ کی راہ تلاش کرنا چاہیے۔ مثلاً ذکر ونماز، تلاوت وغیرہ عباداتِ مقصودہ کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔

چناں چہ حضرت نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو بھی اس کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَ إِلٰى رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (الشرح: ۷-۸) (لہٰذا جب تم فارغ ہو جاؤ تو (عبادت میں) اپنے آپ کو تھکاؤ اور اپنے پروردگار ہی سے دل لگاؤ۔) حضرت عبداللہ بن مسعود رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" إذا فَرَغْتَ مِنَ الفَرَائِضِ فَانْصَبْ فِيْ قِيَامِ اللَّيْلِ "(جب آپ فرائض سے فارغ ہو جائیں تو رات کی نماز (تہجد) میں مشغول ہو جائیے) لیکن بہت سے مفسرین جن میں حضرت حسن بصری، حضرت قتادہ، حضرت مجاہد وغیرہ ہیں، فرماتے ہیں کہ جب آپ تبلیغ کے کام سے، یا جہاد یا قتال سے اور مخلوق کی خدمات سے فارغ ہو جائیں تو رب کی عبادت میں مصروف ہو جائیں۔

(تفسیر القرطبي: ۲۰/۱۰۹، معالم التفسیر: ۴۶۶، الدر المنثور: ۸/۵۵۲)

حضرت جنید بغدادی رَحِمَهُ اللهُ نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے: " إِذَا فَرَغْتَ مِنْ أَمْرِ الْخَلْقِ فَاجْتَهِدْ فِيْ عِبَادَةِ الْحَقِّ "(جب آپ خلق کے کام

سے (جس میں تبلیغ ودعوت، درس ووعظ، نیز ملی وسیاسی امور سب داخل ہیں) فارغ ہوجائیں تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں۔) (تفسیر القرطبي:۲۰/۱۰۹)

آج عام طور پر علما میں یہ کوتاہی مشاہد ہے (الا ماشاء اللہ) کہ صرف قرب بالواسطہ پر اکتفا کیے ہوئے ہیں اور اصل قرب کی طرف توجہ نہیں ہے: کوئی درس و تدریس میں لگا ہے تو بس اسی پر اکتفا کیے ہوئے ہے اور کوئی وعظ وتقریر میں لگا ہے تو وہ اسی پر بس کیے ہوئے ہے، کوئی تحقیقی کام میں لگا ہے، تو وہ اسی کو اپنی معراج سمجھا ہوا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ درس وتدریس، وعظ وارشاد، قضا وافتا وغیرہ مناصب بھی قرب بالواسطہ ہونے کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ سب کام محض رضائے الٰہی کے لیے ہوں، ورنہ یہ سب کام بہ جائے قرب کے، ذریعۂ بُعد ہوں گے؛ لہٰذا اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ تمام اُمور کی انجام دہی کی فکر کرنا چاہیے۔

یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کا استحضارِ موت

فرمایا کہ محدث محمد بن فضل رحمہ اللہ اور محدث یحییٰ بن معین رحمہ اللہ دونوں اپنے زمانے میں فنِ حدیث کے بڑے ائمہ مانے جاتے ہیں، ایک بار یحییٰ بن معین رحمہ اللہ کو محمد بن فضل رحمہ اللہ سے ایک حدیث لینی تھی، چناں چہ یحییٰ بن معین رحمہ اللہ، محمد بن فضل رحمہ اللہ کے پاس پہنچے اور حدیث سنانے کی گذارش کی، تو وہ سنانے لگے اور سند بیان فرمائی: " حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ سَلَمَةَ " (مجھ سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی) تو یحییٰ بن معین نے کہا کہ حضرت! میں زبانی نہیں؛ بل کہ آپ کی کاپی سے سننا چاہتا ہوں، تو محمد بن فضل رحمہ اللہ کہنے لگے میری کاپی اندر کمرے میں رکھی ہے، لاتا ہوں، یہ کہہ کر اندر جانے لگے، تو یحییٰ بن معین رحمہ اللہ

نے ان کے کپڑے پکڑ لیے اور کہا کہ حضرت! پہلے آپ زبانی ہی سنا دیجیے، کیا خبر کہ آپ کے اندر سے کاپی لانے تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں؟ اس لیے پہلے زبانی ہی سنا دیجیے، پھر اگر اللہ نے زندگی دی تو کاپی سے بھی سن لوں گا۔ اس واقعے کو شمائل ترمذی میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس کے سلسلے کی ایک حدیث کے درمیان میں ضمناً ذکر کیا ہے۔

(الشمائل للترمذي:۵)

اس طرح موت کا استحضار ہوگا تو زندگی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا، اس لیے کہ موت کا استحضار نہیں ہوتا، تو انسان یہ سمجھتا ہے کہ کل توبہ کرلوں گا، آئندہ توبہ کرلوں گا، اس طرح ٹالتا رہتا ہے، اگر موت کا استحضار ہو تو ایسا نہیں ہوگا۔

آج دنیا میں بڑے اللہ والے کیوں نہیں؟

ایک مرتبہ احقر (مرتب) نے حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! آج دنیا میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ جیسے بڑے بڑے اللہ والے کیوں نہیں ہیں؟ تو حضرت نے فرمایا کہ آج بھی ایسے اللہ والے موجود ہیں؛ مگر لوگ غلطی یہ کرتے ہیں کہ اللہ والے جب آخری عمر میں پہنچ کر ساری دنیا میں چمکتے ہیں، شہرت پا لیتے ہیں، تب ان کو جانتے یا مانتے ہیں اور ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، شروع سے ان کو عام طور پر لوگ نہیں پہچانتے، خود حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ کو ان کی جوانی میں کون جانتا پہچانتا تھا؟ حال آں کہ وہ اس وقت بھی بڑے اللہ والے تھے، یہی کیا ان کے بھی اکابر حضرت گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ و حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سب کے

ساتھ لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے، ہاں جن کی آنکھیں ہوتی ہیں وہ اسی وقت ان کو پہچان لیتے ہیں اور اسی وقت رجوع کرتے ہیں اور منزل مقصود کو پہنچ جاتے ہیں، پھر فرمایا کہ شہرت حاصل ہو جانے کے بعد پہچاننا اور اصلاح کے لیے رجوع کرنا کوئی خاص بات نہیں، اس وقت تو سب کرتے ہیں، کمال تو یہ ہے کہ شہرت سے پہلے ہی اللہ والوں کو پہچانا جائے اور ان کی طرف رجوع ہو کر اپنی اصلاح کرائی جائے، اس سے اخلاص کا پتہ چلتا ہے اور شہرت کی بنیاد پر کسی کی طرف رجوع کرنے میں ہو سکتا ہے کہ نفس کا کوئی کید پوشیدہ ہو اور جو ان اغراض فاسدہ کو دل میں لیے ہوئے اولیاء اللہ سے رجوع کرتے ہیں، وہ کامیاب نہیں ہوتے، بہت سے لوگ اس نکتے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بغیر اصلاح کے یوں ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁

نتیجۂ فکر: حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب شعیب مفتاحی دامت برکاتہم

اصلاح کی ہو خواہش تو تم یہ کام کرلو
اول قدم میں خود کو رب کا غلام کرلو

تم ذکر وفکر رب میں تن من سبھی لگادو
غفلت کی زندگی کو خود پر حرام کرلو

مخفی رہے نہ تم سے ، راز حیاتِ قلبی
بچنے کا تم گناہوں سے اہتمام کرلو

اخلاق کو سنوارو ، عادات کو بنالو
اس کے لیے صحیح و محکم نظام کرلو

شیطان کی وجہ سے رستہ یہ پر خطر ہے
چلنے کو ایک رہبر کا انتظام کرلو

خواہش اگر ہو تم کو محبوبِ رب بنو تم
جاری زباں پہ اپنی مالک کا نام کرلو

حاصل ہو نیک صحبت اس کا دھیان رکھنا
صحبت کی تم بروں کی یک دم سلام کرلو

سالک بغیر تقویٰ رہتا نہیں ہے زندہ
یہ بات دل میں رکھ کر اصلاح تام کرلو

اللہ سے تعلق اس راہ کا ہے مقصد
اس کے حصول میں تم کوشش تمام کرلو

ملتی نہیں ہے یوں ہی اللہ کی محبت
اس کے لیے ریاضت تم صبح وشام کرلو

ناکام ہے یہاں پر لذات کا پجاری
خود پر حرام تم ہی مینا وجام کرلو

پاتا نہیں خدا کو جو نفس کا ہو تابع
نفس شریر وسرکش کی روک تھام کرلو

یہ عرضِ مخلصانہ احقر شعیبؔ کی ہے
اس کا نصیحتوں میں تم انضمام کرلو